حقیقت عبودیت

مولانا صدر الدّین اصلاحی

مکتبہ تعلیمات رام پور۔ یوپی

از افاداتِ امام ابنِ تیمیہؒ

مترجم

مولانا صدرالدین اصلاحی

مکتبۂ تعلیمات رام پور۔ یو پی

(دوسرا ایڈیشن)

طبع اوّل ۱۰۰۰

تاریخ اشاعت نومبر سنہ ۱۹۶۰ء

قیمت ایک روپیہ ۳۵ نئے پیسے

فیضی پریس سے طبع کرا کر یوسف اصلاحی نے مکتبہ تعلیمات رامپور سے شائع کیا۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

دین میں اس کی بنیادی اصطلاحوں کی ٹھیک وہی حیثیت ہے جو انسان کے جسم میں اعضائے رئیسہ کی ہوتی ہے۔ اگر دل اور دماغ اور جگر وغیرہ اپنی صحیح حالت پر ہوں تو جسم تندرست اور توانا حالت میں رہ سکتا ہے، اور اگر ان اعضاء میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تو جسم کی صحت اور توانائی ہرگز باقی نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح دین کی بنیادی اصطلاحات کا اصل اور صحت مند مفہوم اگر ذہنوں میں موجود رہا تو صرف اسی صورت میں دین کے حقیقی مفہوم اور اس کے صحیح تقاضوں سے وہ باخبر رہ سکتے ہیں، ورنہ ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا۔ دراصل یہی اصطلاحات ہیں جو دین کے حقیقی مزاج اور مقصد کو پوری طرح روشنی میں لاتی ہیں۔ اب اگر خود یہی اپنے ٹھیک مفہوم میں باقی نہ رہ جائیں تو پھر دین کے مزاج و مقصد کی تعین و توضیح کس طرح کر سکیں گی۔

انہی اصطلاحات میں سے ایک "عبادت" کی اصطلاح بھی ہے، جس کی دین میں بڑی بنیادی اہمیت ہے۔ بلکہ بعض اعتبارات سے تو ساری دینی اصطلاحوں میں یہ سب سے زیادہ اہمیت کی مالک ہے، اور جب تک اس کا صحیح مفہوم ذہن نشین نہیں ہو جاتا دوسری تمام اصطلاحات کا مفہوم و مدعا بھی ٹھیک ٹھیک نہیں جانا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت ہی انسان کا فریضۂ زندگی ہے، اور وہ عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ) اس لیے ایک شخص کے ذہن میں "عبادت" کا تصور جیسا کچھ ہوتا ہے اسی کے مطابق

رب اور اللہ، رسول اور نبی، دین، اور شریعت وغیرہ دینی اصطلاحات کا تصور بھی آپ سے آپ بن جاتا ہے، یا کم سے کم یہ کہ بن جا سکتا ہے۔ اس لیے اس بات کی بڑی اہمیت اور ضرورت ہے کہ اس دینی اصطلاح کے مفہوم کو ذہنوں میں اچھی طرح واضح کر لیا جائے اور ہمیشہ واضح رکھا جائے۔ اگر دینی تصورات کا یہ مرکزی نقطہ درست رہا تو یقین ہے کہ یہ پورا سلسلہ غلط فکریوں سے محفوظ رہیگا

اگرچہ عبادت کی قائم مقام اصطلاح سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں، مگر اسلام میں اس اصطلاح کا مفہوم ہے وہ غالباً اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ قرآن عبادتِ الٰہی کا جو تصور دیتا ہے وہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ دین و شریعت کا کوئی جزو بھی اس سے باہر نہیں رہ جاتا۔ بلکہ مسجد کے رکوع و سجود سے لے کر کسب معاش تک کا ہر صالح عمل اس کے نزدیک عبادت ہے۔ لیکن جس طرح کسی بوجھ کو ایک کمزور ارادے اور کم طاقت والے شخص کے لیے دیر تک اٹھائے رہنا مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح اسلام کے اس وسیع اور ہمہ گیر تصورِ عبادت کو ہر شخص کے لیے اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا کچھ آسان نہیں۔ چنانچہ تاریخ اسلام بتاتی ہے کہ دورِ صحابہ کے بعد ہی سے اس حقیقت کا ظہور شروع ہو گیا تھا اور مسلمانوں میں عبادت کے تصور کو صرف مسجد کے ساتھ باندھ لینے کی ابتداء ہو چکی تھی۔

عبادت کے اس محدود تصور کے پیدا کرنے میں دو چیزوں کا خاص دخل ہوتا ہے:۔ ایک تو دنیا پرستانہ سیاست، دوسرے غیر اسلامی تصوف۔ یہ دو فتنے ہیں جو اسلام کے تصورِ عبادت کے دشمن چلے آرہے ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا زمانہ ان دونوں فتنوں کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس لیے اس وقت عبادت کا یہ غیر اسلامی تصور بھی بڑی شدت سے پھیلا ہوا تھا، یا یوں کہیے کہ اسلام کے دانا دشمنوں اور اس کے نادان دوستوں، دونوں نے اسے پھیلا رکھا تھا۔ وقت کے اس مجدد نے جس طرح بے شمار فتنوں کے خلاف کامیاب جہاد کیا تھا اسی طرح اس فتنے کی طرف بھی پوری توجہ

کی، اور اپنے ایک رسالے "العبودیۃ" میں پوری تفصیل اور مضبوط دلائل سے واضح کیا کہ عبادت، ایک جامع لفظ ہے جو پورے دین اور سارے اعمال صالحہ کو محیط ہے۔ یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسی رسالے کا ترجمہ ہے، اس کے مطالعے کی ضرورت آج شاید امام موصوف کے زمانے سے بھی زیادہ شدید ہی ہوگی، کیونکہ عبادت کا صحیح اسلامی تصور آج کے فتنوں بھرے دور میں اس سے کہیں زیادہ اجنبی اور نامانوس بنکر رہ گیا ہے جتنا کہ اُس دور میں تھا۔

ترجمہ لفظی نہیں ہے، بلکہ آزاد ہے، جسے ترجمہ کے بجائے ترجمانی کہنا زیادہ صحیح ہوگا بعض مقامات پر عبارت کے ربط کو واضح کرنے کے لیے کچھ الفاظ کا یا کسی مستقل جملہ کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح رسالے کے آخر کے بعض مباحث ترجمے میں حذف بھی کر دیے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق کچھ ایسی بدعاتِ تصوّف پر تھا جو اس وقت عام طور سے بہت کم پائی جاتی ہیں۔

کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے جو نظر ثانی کے بعد شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ نظر ثانی کے بعد اس کی افادیت بھی کچھ نہ کچھ بڑھ گئی ہوگی۔

صدرالدین

امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آیت کریمہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ (بقرہ) کا کیا مطلب ہے؟ "عبادت" کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے اصول و فروع کیا ہیں؟ آیا دین پورے کا پورا اس لفظ "عبادت" میں داخل ہے یا نہیں، اور یہ لفظ دین کے تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے یا دین کے کچھ شعبے اس کی حدود سے خارج ہیں؟ عبودیت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا عبودیت ہی کسی مخلوق کے شرف و مجد کا منتہائے کمال ہے یا اس سے بلند تر کوئی مقام اور بھی ہے؟ ۔
امامِ موصوف نے اس کو جواب میں یہ مفصل تقریر فرمائی ۔

عبادت کے مفہوم کی وسعت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "عبادت" ایک جامع لفظ ہے، اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، راست گوئی، امانت، صلہ رحمی، دیانت، اطاعتِ والدین، ایفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پڑوسیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مملوکوں کے ساتھ ـــــ خواہ یہ مملوک انسان ہوں خواہ جانور ـــــ نیک سلوک، دعا، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن اور اسی قسم کے تمام اعمالِ صالحہ عبادت کے اجزاء ہیں۔ اسی طرح اللہ کی اور اس کے رسول کی محبت، رحمتِ خداوندی کی امید اور عذابِ الٰہی کا خوف، خشیت، انابت، اخلاص، صبر، شکر، توکل، اور تسلیم و رضا وغیرہ تمام صفاتِ حسنہ

عبادت کی حدود میں شامل ہیں۔

تخلیق انسانی کی غایت مقصود

عبادت ہی وہ تنہا غایت اور مقصد ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ سارا کارخانہ عالم پیدا کیا ہے، جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (ذاریات) — میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔

اور دنیا میں جو رسول بھی بھیجا گیا، اسی غایت کی خاطر اور اسی مقصد کی تذکیر و تبلیغ کے لئے بھیجا گیا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

اُعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ (سورہ اعراف) — اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

یہی بات حضرت ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ، غرض تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم سے کہی تھی اور قرآن صراحت سے سو فی صد کلی انداز میں کہتا ہے:-

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (سورہ نحل) — ہم نے ہر قوم میں ایک پیغامبر بھیجا، جس کا یہ پیغام دے کر اے لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے دور رہو۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (سورہ انبیاء) — اے نبی! تم سے پہلے ہم نے جس پیغمبر کو بھی بھیجا اس کو ہم نے یہی وحی کی تھی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کرو۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً — بلاشبہ تم لوگوں کا دین ہے ایک ہی دین،

وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (سورہ انبیاء) — اور میں تم سب کا رب ہوں، سو میری عبادت کرو۔

یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہنی چاہیے کہ ان آیات میں "فَاعْبُدُوْنِ" کا خطاب صرف عوام، یعنی امتیوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ خود اس دعوت کے داعی اور اس پیغام کے مبلغ انبیائے کرام بھی اس کے مخاطب اور مکلف تھے، جس کا ذکر ایک دوسرے مقام پر اس طرح کیا گیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ — اے رسولو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (مومنون) — نیک عمل کرو، بلاشبہ میں تمہارے اعمال سے واقف ہوں۔

ایک اور آیت لیجیے جس میں اس چیز کو مزید وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (حجر) — اے محمد! اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ یقینی شے (موت کا وقت) آجائے۔

پھر یہی عبادت وہ چیز ہے جس کا انبیاء اور ملائکہ کی صفت کمال کے طور پر اللہ تعالیٰ بار بار ذکر کرتا ہے:۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ — آسمان اور زمین میں جو لوگ ہیں وہ سب

وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ — اسی کے ہیں جو (ملائکہ) اس کے حضور میں

عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۔ (انبیاء)

ہیں، وہ نہ کبھی انکی عبادت سے سرتابی کرتے ہیں نہ اس سے تھکتے ہیں، رات دن اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اور اس میں ذرا بھی سست نہیں پڑتے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ (سورہ اعراف)

جو ملائکہ تیرے رب کے پاس ہیں وہ بھی اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے وہ اس کی تسبیح کرتے رہتے اور اسی کی جناب میں سربسجود رہتے ہیں ۔

اس کے برعکس وہ لوگ جو اپنی اس غایتِ آفرینش کو پورا نہیں کرتے اور اللہ تعالٰی کے سامنے بندگی و سرفگندگی کا اظہار کرنے کے بجائے استکبار سے کام لیتے ہیں، ان کے بارے میں آقائے کائنات یہ فرماتا ہے کہ :-

اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (سورۂ غافر)

بے شک جو لوگ میری عبادت سے منہ موڑتے اور بڑے بنتے ہیں وہ دوزخ میں ذلیل وخوار داخل ہوں گے ۔

عبدیت، انسان کا بلند ترین مقام

عبادت ہی جب تخلیق کی غرض و غایت ٹھیری تو کھلی بات ہے کہ اس غرض کا پورا کرنا ہی خالق کی خوشنودی کا باعث ہوگا، اور کسی مخلوق کی انتہائی برتری اور برگزیدگی کے معنی لازماً یہی ہوں گے کہ وہ اپنے عمل سے عبدیت کے انتہائی مقام پر پہنچا ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالٰے جب اپنے خاص اور مقرب

بندوں کا شفقت و محبت اور اعزاز و تکریم کے ساتھ تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو یہ تذکرہ وہ انھیں اسی نسبت عبدیت سے متصف فرما کر کرتا ہے اور ان کو "عبد" کے نام سے یاد کرتا ہے :۔

عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (دہر)	ایک چشمہ جس سے "عباد اللہ" (اللہ کے بندے) سیراب ہوں گے۔
عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان)	رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔

جب شیطان نے اپنی ملعونیت کی سزا سن کر اللہ کے حضور میں کہا تھا کہ میں اس کے بدلے میں تیرے بندوں کو سبز باغ دکھا دکھا کر گمراہ کروں گا تو بارگاہ رب العزت سے ارشاد ہوا تھا :۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغَاوِیْنَ (حجر)	بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہ چلے گا، لیکن ہاں وہ گمراہ جو تیرا اتباع کرلیں۔

ملائکہ کے متعلق ارشاد ہے :۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ... وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (انبیاء)	اور یہ کافر کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنی اولاد بنائی ہے، پاک و برتر ہے اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے۔ بلکہ وہ تو اللہ کے باعزت بندے ہیں .... اور اس کے خوف سے ہمیشہ لرزاں رہتے ہیں۔

حضرت مسیحؑ کے بارے میں جن کے متعلق نبوت کے ساتھ الوہیت کا دعویٰ بھی کر دیا گیا تھا، ارشاد الٰہی ہوتا ہے:۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (زخرف)	وہ تو محض ایک بندہ تھا، جس پر ہم نے اپنا انعام کیا تھا۔

چنانچہ اسی لیے کہ کہیں مسلمان پیغمبر آخر الزماںؐ کے معاملہ میں یہی غلطی نہ کر بیٹھیں کہ انھیں ان کے اصلی مقام ——— مقام عبدیت ——— سے ہٹا دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو کھلے لفظوں میں وصیت فرما دی تھی کہ:۔

لا تطروني كما اطرت النصارى عيسى بن مريم - انما انا عبد فقولوا عبد الله ورسوله (الحديث)	میری ستائش میں غلو نہ کرنا جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کو سراہ کر حد سے بڑھا دیا۔ میں تو محض ایک بندہ ہوں، سو مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہنا۔

چنانچہ قرآن مجید میں تمام بندگان خاص اور ملائکہ اور دیگر انبیائے کرام کی طرح آپؐ کا ذکر بھی اسی لفظ "عبد" سے ہوتا ہے۔ معراج جیسے عظمت نشان واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے:۔

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا ... الخ (اسراء)	پاک و برتر ہے وہ خدا جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا۔
فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى	اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی

طرف جو کچھ وحی کی گئی (سورۂ نجم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ رسالت کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :-

وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (سورۂ جن)

اور جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا اس کو پکارنے (نماز پڑھنے) تو قریب تھا کہ لوگ اس پر پل پڑیں۔

منکرین قرآن کو چیلنج دیتے اور رسول اکرم کی طرف سے تحدی کرتے ہوئے کہا جاتا ہے :-

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (بقرہ)

اور اگر تم اس چیز کے (منجانب اللہ ہونے کے) بارے میں شک رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو پھر تم بھی ایک ہی سورہ (بنا کر مقابلہ میں) لاؤ

دین اور عبادت کی معنوی نسبت

ان نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ عبدیت مخلوق کے شرف مجد اور اس کی سعادت کی معراج کمال ہے، وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ "عبادت" میں داخل ہے۔ سارے انبیاء اللہ کا دین سکھانے آئے ..... جیسا کہ قرآن میں متعدد مقامات پر تصریح موجود ہے ..... اور پھر ہر نبی نے اپنے مخاطب لوگوں کو "فاعبدوہ" (اس کی عبادت کرو) کی ہدایت کی۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت

ہے کہ "دین" اور "عبادت" ایک ہی منشاء و مدعا کی دو مختلف تعبیریں ہیں۔ بخاری کی مشہور حدیثِ جبریلِ اس امر کی پوری وضاحت کر دیتی ہے۔ جبریل علیہ السلام ایک اعرابی کی شکل میں بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے اور آتے ہی صحابہ کرام کے سامنے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام، ایمان اور احسان کے متعلق سوالات کیے، پوچھا کہ "اسلام کیا ہے؟" رسول اللہ صلعم نے جواب دیا "اسلام یہ ہے کہ تم شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، اور یہ کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور بشرطِ استطاعت حج کرو"۔ پھر پوچھا کہ "ایمان کی کیا تعریف ہے؟" ارشاد ہوا "ایمان نام ہے خدا کی وحدانیت پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر، اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر، مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر، اور تقدیر کی برائی اور بھلائی پر دل سے یقین لانے اور رکھنے کا"۔ پھر سوال کیا کہ "احسان کسے کہتے ہیں؟" فرمایا "احسان یہ ہے کہ تم خدا کی عبادت کرو اس طرح کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے"۔ جب جبریل علیہ السلام یہ سوال و جواب کر کے چلے گئے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ جبریل تھے جو تمہیں تمہارا "دین" سکھانے آئے تھے"۔ (فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ)۔

دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام چیزوں کو "دین" فرمایا، درآں حالیکہ انہی تمام چیزوں کے مجموعہ کا نام "عبادت" بھی ہے۔

"دین" اور "عبادت" کی لغوی تحقیق آؤ "دین" اور "عبادت"

کے الفاظ پر غور کر کے دیکھیں کہ لغت میں ان کا مفہوم اور مدلول کیا ہے؟۔

"دین" کے لغوی معنی ہیں عاجزانہ سرفگندگی، خضوع اور تذلل۔ اہلِ عرب کہتے ہیں "دِنْتُهٗ فَدَانَ" یعنی میں نے اس کو بے بس و ناچار اور مطیع و منقاد بنا اور وہ ایسا بن گیا "نَدِیْنُ اللّٰهَ" و "نَدِیْنُ لِلّٰهِ" یعنی ہم خدا کی اطاعت کرتے ہیں اور اپنے کو اس کے سامنے ڈال دیتے ہیں، پس "اللہ کے دین" کا مطلب ہوا اس کی اطاعت و بندگی اور اس کے سامنے اظہارِ تذلل و سرفگندگی۔

"عبادت" کا لغوی مفہوم بھی اس کے قریب ہے، اور اس لفظ کے معنی بھی تذلل اور کامل انقیاد کے ہیں۔ چنانچہ اہلِ عرب اس راستہ کو، جو کثرتِ آمد و رفت کی وجہ سے راہ گیروں کے قدموں سے خوب روندا جا چکا اور بالکل صاف اور ہموار ہو گیا ہو "طریقٌ مُعَبَّدٌ" کہتے ہیں۔ لیکن اصطلاحِ شریعت میں "عبادت" کا مفہوم اسی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ تذلل اور سرفگندگی کے ساتھ اس میں محبت کا عنصر بھی شامل ہے۔ یعنی عبادت، شریعت کی زبان میں، اللہ تعالےٰ کے روبرو انتہائی تذلل اور کامل محبت دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر عربی میں "تیم" کا لفظ "عبد" کے معنی میں آتا ہے، جب کہ تَتَیُّم محبت کے آخری درجہ کا نام ہے (جس طرح کہ اس کے پہلے درجہ کو "علاقہ" دوسرے کو "صبابہ" تیسرے کو "غرام" چوتھے کو "عشق" کہتے ہیں) اور اس لیے متیم اس شخص کو کہیں گے جو اپنے محبوب میں بالکل کھو گیا اور اس کے سامنے بالکل بچھ گیا ہو یعنی اس کا کامل غلام بن گیا ہو۔ اب یہ جو "تیم اور تیم" کے الفاظ "عبد" کے معنی میں

آتے ہیں، تو یہ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عبادت کے اندر محبت کا بلکہ یوں کہیے کہ عشق کامل کا بھی مفہوم موجود ہے۔ پس اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے سامنے جھکتا تو ہے مگر ارادت اور محبت کے بجائے بغض اور کراہت قلبی کے ساتھ جھکتا ہے، یا وہ کسی سے محبت تو کرتا ہے مگر اس کے ساتھ فروتنی اور سرفگندگی کا رویہ اختیار نہیں کرتا ـــــ جیسا کہ ایک باپ کا اپنے بیٹے سے، یا ایک دوست کا اپنے دوست سے معاملہ ہوتا ہے ـــــ تو ایسی حالت میں اس کو "عبد" یا "عابد" نہ کہا جائیگا۔

لفظ "عبادت" کی اس تشریح کو سامنے رکھیے تو یہ حقیقت خود بخود بے نقاب ہو جاتی ہے کہ شریعت نے جس عبادتِ الٰہی کا ہمیں حکم دیا اور جسے ہمارا مقصدِ زندگی قرار دیا ہے اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا اگر اس کے اندر ان دونوں چیزوں (تعظیم اور محبت) میں سے صرف ایک ہی چیز ہو اور اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بندہ کے نزدیک کائنات کی ہر شے سے زیادہ محبوب بھی ہو اور ہر چیز سے زیادہ مکرم و معظم بھی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اہل محبت اور کامل تعظیم و تکریم کا مستحق صرف اللہ ہی ہے، اور ہر وہ محبت غلط اور نادرست ہے جو غیر اللہ سے کی جائے اگر اللہ کے لئے نہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ تعظیم اسلا باطل اور ناروا ہے جو کسی ماسوا کی کی جائے اور فرمانِ الٰہی کے تحت نہ ہو۔ حق تعالیٰ کا کہنا ہے کہ:-

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا

(اے نبی مسلمانوں سے) کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، وہ مال جن کو تم نے کما رکھا ہے، وہ تجارت جس کے سرد

أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهِ۔ (توبہ)

پڑ جائے گا تمہیں اندیشہ لگا رہتا ہے اور وہ مکان جن کو تم بہت پسند کرتے ہو — اگر یہ تمام چیزیں تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو ٹھیرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم سامنے لے آئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ محبت اصلاً خدا ہی کا حق ہے اور نبی سے کی جانیوالی محبت بھی اس کی تبعیت میں ہونی چاہئے۔ ویسے شرعاً بہرحال یہ بھی مسلم ہی ہے کہ محبت خدا اور محبت رسول دونوں ضروری ہے، جس طرح کہ اطاعت مطلق اور طلب رضا دونوں کی ضروری ہے، جیساکہ فرمایا:۔

وَاللهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ۔ (توبہ)

اللہ اور رسول اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ یہ لوگ انھیں خوش رکھیں۔

• اور جس طرح کہ صاحب حکم و امر دونوں ہی ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ الخ (توبہ)

اگر یہ لوگ راضی ہوتے اس چیز پر جس کو اللہ اور رسول نے انہیں دیا تھا الخ

لیکن یاد رہے کہ عبادت اور اس کے لوازم مثلاً توکل، اور خوف و رجا وغیرہ کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ان امور میں اس کا رسول بھی کسی حیثیت سے اس کا شریک نہیں ہے۔ قرآن میں ہے کہ:۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا

(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان

نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران)

یکساں ہے۔ یعنی یہ کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ پھر اگر یہ لوگ تمہاری یہ بات نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو "مسلم" (یعنی اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنیوالے) ہیں۔

اب دونوں تصورات کی ایک جامع آیت سنیے :۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ (توبہ)

کیا خوب ہوتا اگر وہ لوگ راضی ہو جاتے اس چیز پر جس کو اللہ اور اس کے رسول نے انہیں دیا تھا، اور کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے وہ اپنے فضل سے ہم کو آئندہ اور بھی دے گا اور اس کا رسول۔ ہم تو خدا ہی کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔

دیکھو اس آیت سے دونوں باتیں ثابت ہوگئیں :۔ یہ بھی کہ صاحب امر و نہی اللہ بھی ہے اور اس کا رسول بھی، (جیسا کہ ایک دوسری آیت وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر) میں اس کی کھلی ہوئی صراحت موجود ہے) اور یہ بھی کہ "حسب" یعنی کفایت کنندہ اور کارساز اور معتمد علیہ صرف اللہ جل شانہ ہے۔ اور اس حقیقت کو بھی ایک سے زائد آیتوں میں بوضاحت بیان کر دیا گیا ہے، مثلاً :۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ مکہ والوں نے تمہارے مقابلہ کیلئے بڑی جمعیت اور سامان

فَزَادَهُمْ إِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۔ (آل عمران) — فراہم کیا ہے، سو ان سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے کہا کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ — اے نبی! تمہارے لیے اللہ کافی ہے۔

(انفال)

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ — کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟

(زمر)

اب ہم لفظ "عبد" اور "عبادت" پر تحقیق و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں۔ "عبد" کے دو معنی ہیں۔ معبد اور عابد۔ "معبد" کے معنی ہیں مشیتِ الٰہی کے فیصلوں کا پابند اور مجبورِ محض غلام، جو خدا کے احکامِ قضا کے سامنے پیدائشی طور پر بالکل جھکا ہوا ہو اور اللہ تعالےٰ اس کے احوال و معاملات کو جس طرح چاہتا ہو بناتا بگاڑتا اور الٹتا رہتا ہو۔

عبدیت کا تکوینی مفہوم

اس معنیٰ کے اعتبار سے کائناتِ عالم کا ایک ایک ذرہ بغیر کسی استثناء کے، خدا کا "عبد" ہے۔ نیکوکار ہوں یا بدکار، مومن ہوں یا کافر، متقی ہوں یا فاجر، اہلِ جنت ہوں یا اہلِ نار، سب کے سب اس کے یکساں طور پر "عبد" ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سب کا رب ہے، سب کا مالک ہے، سب کا خالق ہے، اور ان میں سے کوئی اس کی مشیت اور فیصلے سے بال برابر بھی باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، خواہ اس کے خلاف ہونے کی کتنی ہی خواہش کیوں نہ کی جائے۔ اسی طرح جو کچھ وہ نہیں چاہتا وہ

کبھی صورتِ وجود اختیار نہیں کر سکتا، خواہ اس کی کتنی ہی شدید تمنا کیوں نہ کی جائے۔
یہی حقیقت ہے جو قرآنِ حکیم کے ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:-

لَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (آل عمران)

جو کوئی بھی آسمان اور زمین میں ہے چار و ناچار اس کے سامنے سرفگندہ ہے اور اسی کے حضور سب لوٹائے جائیں گے۔

غرض اللہ تعالیٰ ہی سب کا پروردگار ہے، سب کا خالق ہے، سب کا رازق ہے، سب کا زندگی بخشنے والا، سب کا مارنے والا، سب کے دلوں کو پھیرنے والا اور سب کے عواقب و احوال کے اندر حسبِ منشاء تصرف کرنیوالا ہے، اس کے سوا کوئی بھی اس کا رب، خالق اور مالک نہیں، خواہ کوئی اس بدیہی بات کا اعتراف کرے یا نہ کرے اور اس روشن حقیقت سے واقف ہو یا نہ ہو۔

عبد اور عبدیت کے اس مفہوم کے لحاظ سے تو اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں اللہ تعالیٰ کے بالکل ایک سے عبد ہوتے ہیں۔ لیکن اب اس سے آگے چل کر دونوں کی حیثیتیں الگ ہو جاتی ہیں اور دونوں کے درمیان ایک خطِ امتیاز کھنچ جاتا ہے۔ اہلِ ایمان تو اس بدیہی بات اور روشن حقیقت، کا علم بھی رکھتے ہیں اور اس علم کے ساتھ ساتھ دل کی گہرائیوں میں اس پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ لیکن جو ایمان کی روشنی سے محروم ہیں وہ یا تو اس حقیقت کا جیسا چاہیے ویسا علم ہی نہیں رکھتے، یا علم تو رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور پروردگارِ حقیقی کے خلاف اپنی کبریائی کا علم بلند کر دیتے اور اس کے سامنے جھکنے کے بجائے استکبار کی روش پر جم جاتے ہیں اگرچہ اندر سے ان کا بھی دل گواہی یہی دیتا ہے کہ اللہ ہی نے انھیں پیدا کیا ہے۔

اور وہی انھیں رزق دیتا ہے۔ یہ دونوں ہی قسم کے لوگ ایمان و کفر کے لحاظ سے ایک ہی پوزیشن رکھتے ہیں اور دونوں کے دونوں حق کے یکساں منکر ہوئے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ دوسری قسم کے لوگوں کا مذکورہ حقیقت سے واقف ہونا ان کی حیثیتِ ایمانی پر کوئی اثر ڈالتا ہوگا، نہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ حق کے جس علم و واقفیت کے ساتھ انکار و سرکشی بھی موجود ہو وہ علم و واقفیت علامتِ ایمان اور موجبِ نجات کسی طرح نہیں بلکہ وہ تو اور زیادہ عذاب کا باعث ہے۔ چنانچہ فرعون اور فرعونیوں کے حق میں قرآن فرماتا ہے :-

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ۔ (نمل ۱)	باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں (کی صداقت) کا یقین رکھتے تھے، لیکن وہ زیادتی اور سرکشی کی بنا پر ان کے ماننے سے انکار کر گئے۔ سو دیکھو ان مفسدوں کا کیسا انجام ہوا۔

اسی طرح اہلِ کتاب کے متعلق فرمایا گیا ہے :-

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝۔ (بقرہ)	جن لوگوں کو (پہلے) ہم نے کتاب دی تھی وہ اس (نبی) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے امرِ حق کو چھپاتا ہے۔
فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ	دراصل یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے (بلکہ دل

الظَّالِمِینَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ۔ (انعام)

میں تمہیں سچا ہی سمجھتے ہیں، لیکن یہ ظالم خدا کی آیتوں کا (انھیں حق باور کرتے ہوئے بھی) انکار کر رہے ہیں۔

غرض بندہ کا اللہ تعالیٰ کے متعلق صرف اس قدر علم و اعتراف، کہ وہی اس کا پروردگار اور خالق ہے اور وہ ہر حال میں اس کا محتاج اور نیاز مند ہے، اپنی صرف اُس عبودیت کا اقرار ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہے۔ ایسا شخص اپنے ربِ حقیقی کے سامنے بوقت ضرورت دستِ سوال بھی پھیلایا کرتا ہے، اس کے سامنے گڑگڑاتا بھی ہے اور اس پر بھروسہ بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے احکام کی اطاعت میں ثابت قدم نہیں نکلتا۔ وہ کبھی ان کو مانتا ہے کبھی نہیں مانتا، کبھی خدا کے روبرو جھکتا ہے تو کبھی شیاطین کے اور بتوں کے سامنے سجدہ ریز نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی عبودیت ——— یعنے اللہ تعالےٰ کی محض صفتِ ربوبیت کے علم و یقین رکھنے کی بنا پر کسی شخص کو مومن نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔ اور نہ اس کے پیشِ نظر اسے دوزخی کے بجائے جنتی شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کا "ایمان" اپنے وجود و عدم کے لحاظ سے یکساں ہے۔ قرآن میں ہے :۔

وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ ۔ (یوسف)

اور ان میں سے بیشتر تو اللہ پر اس طرح ایمان رکھتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس کی خدائی میں شریک ٹھیراتے ہوتے ہیں۔

چنانچہ مشرکین کو بھی اس سے انکار نہ تھا کہ اللہ ہی سب کا خالق اور رازق ہے۔ قرآنِ حکیم نے کبھی ان پر یہ الزام نہیں رکھا کہ وہ خدا کی خالقیت اور رازقیت

کو نہیں تسلیم کرتے۔ اس کا ان پر الزام صرف یہ تھا کہ اس علم و اقرار کے باوجود، کہ خدا ہی سب کو وجود بخشتا اور سامانِ زیست بہم پہنچاتا ہے، وہ دوسروں کو اس کی معبودیت میں حصہ دار ٹھہراتے ہیں :-

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۔ (عنکبوت)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کئے ہیں اور سورج اور چاند کس نے مسخر کیے ہیں؟ تو جواب دیں گے اللہ نے۔

قُل لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَن فِيهَا إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۔ قُلْ مَن رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ، قُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ قُلْ مَن بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُلْ فَأَنَّىٰ تُسْحَرُونَ ۔

(مومنون)

ان سے کہو یہ زمین اور اس کے بسنے والے کس کے ہیں؟ (ذرا بتاؤ تو سہی) اگر تم جانتے ہو جواب دیں گے اللہ کے۔ کہو، تو کیا تم کو ہوش نہیں آتا؟ پوچھو کہ ساتوں آسمانوں کا اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ کہیں گے یہ سب اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ کہو، تو کیا تم ڈرتے نہیں؟ پوچھو کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر شے کی بادشاہت اور حکمرانی ہے اور جو پناہ دیتا ہے مگر اس کے مقابلہ میں کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی؟ (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو! جواب دیں گے (ہر شے کی حکومت) اللہ ہی کے لئے ہے۔ کہو تو پھر کہاں سے تم پر جادو آپڑتا ہے (کہ تمہاری عقل یوں ماری جاتی ہے)

اور یہ (اللہ ہی کا خالق اور رازق ہونا) ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کا انکار

کوئی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بمشکل ہی کر سکتا ہے۔ چنانچہ خدا کے مسلم اور فرمانبردار بندوں ہی کی یہ کوئی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ اُس کے باغی اور نافرمان بندے بھی اس حقیقت کو اسی طرح مانتے ہیں جس طرح کہ اس کے مومن بندے۔ حتیٰ کہ ابلیس لعین بھی اپنی تمام سرکشیوں کے باوجود اس سے انکار کی جرأت نہ کر سکا اور اپنی سزائے ملعونیت سننے کے بعد بھی اس کے منہ سے سب سے پہلے یہی نکلا کہ :۔

رَبِّ أَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (حجر)	اے میرے رب! تو مجھے اس دن تک کی مہلت دے جب کہ لوگ اٹھائے جائیں گے۔
رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (حجر)	اے میرے رب! جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں انھیں دنیا میں ضرور سبز باغ دکھاؤں گا اور ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔
فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (ص)	قسم ہے تیرے عزو جلال کی، میں ضرور ان سب کو جادۂ حق سے پھیروں گا۔

یہ اور اس طرح کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں شیطان اس بات کا علانیہ اقرار کرتا نظر آتا ہے کہ اللہ ہی اُس کا اور سب کا پروردگار اور خالق ہے نہ کہ کوئی اور۔ اسی طرح اہلِ جہنم بھی اس اعتراف میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے، وہ اس امر کا اقرار کریں گے کہ :۔

رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ...... قَالَ	اے ہمارے رب! ہم پر ہماری بدبختی سوار ہو گئی تھی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے .....
أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا (انعام ۲)	اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کیا یہ (سزائے جہنم) واقع ہونے والی چیز نہیں ہے؟ تو جواب دیں گے

کیوں نہیں (یا رب) یوں ہی ہے، قسم ہے ہمارے رب کی۔

پس جو شخص اسی حقیقتِ تکوینی کی حد تک پہنچ کر رک جاتا ہے اور اس عبدیت سے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہے، آگے قدم بڑھا کر حقیقتِ تشریعی کی حدود میں داخل نہیں ہوتا اور اس عبدیت کا قائل اور حامل نہیں بنتا جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی معبودیت اور اس کی اور اس کے پیغمبروں کی اطاعت سے ہے، وہ کسی طرح بھی ابلیس اور اہلِ جہنم کے مقابلہ میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا، بلکہ فی الواقع وہ انہی کی جنس اور زمرہ میں شامل ہے۔ اور اگر اپنی اس حالت کے باوجود وہ اپنے تئیں یہ زعم بھی رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان "بندگانِ خاص" اور "اولیاء مقربین" اور "پہنچے ہوئے عارفین کاملین" میں سے ہے جن سے اتباعِ شریعت کی ذمہ داری ساقط ہو گئی ہے تو وہ کافروں اور ملحدوں سے بھی زیادہ بڑا اور گمراہ انسان ہے۔ اسی طرح جو شخص حضرت خضر یا کسی اور بزرگ کے بارے میں یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ احکامِ شرعی کے مکلف نہیں اس لئے کہ وہ ان کو ارادۂ الٰہی اور اسرارِ تکوینی کا مشاہدہ حاصل ہے، تو اس کا یہ گمان اور قول منکرینِ خدا کے اقوال و اوہام سے بھی زیادہ بیہودہ ہے۔

یہ ہے "عبد" اور "عبدیت" کا ایک مفہوم جس کی اب تک اوپر کی سطروں میں توضیح ہوئی۔ اور جیسا کہ بیان ہو چکا، عبدیت کے اس مفہوم کے لحاظ سے ہر شخص خدا کا عبد ہے۔ کافر بھی اور مومن بھی، حتیٰ کہ جس طرح ایک نبی، اسی طرح ایک شیطان رجیم بھی، اور یہ عبدیت، نجات و کامرانی آخرت کے لئے ذرا بھی مفید نہیں، جب تک کہ انسان اس سے آگے بڑھ کر عبدیت کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے "عبد" نہ بن جائے۔

عبدیت کا تشریعی مفہوم

"عبد" کے دوسرے معنی "عابد" کے ہیں، یعنی

ایسا بندہ جو صرف اللہ ہی کی عبادت کرے، کسی دوسرے کے سامنے اپنی پیشانی نہ جھکائے، اس کی اور اس کے رسولوں کے احکام کی اطاعت کرے، اس کے صالح اور متقی بندوں سے رابطۂ محبت رکھے اور اس کے نافرمان اور باغی بندوں سے ترک تعلق کرلے۔ اس معنی کی "عبدیت" سے وہ شخص بہرہ ور نہیں ہوسکتا جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی عبادت اور اطاعت نہیں کرتا، یا اس کے ساتھ کسی دوسرے "الٰہ" کی بھی عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ کسی ذات کو اِلٰہ تسلیم کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان کا قلب انتہائی شوق و محبت اور پوری تعظیم و تکریم، نیز خوف و رجا، صبر و شکر اور انابت و توکل کے گہرے جذبات کے ساتھ اس کی طرف جھکا ہوا ہو۔ لہٰذا جب کوئی شخص اللہ کے ماسوا بھی کسی کو معبود اور الٰہ بناتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے جذباتِ عبودیت اور احساساتِ شوق و محبت کو تقسیم کردیتا ہے اور وہ صرف اللہ ہی کا عبادت گزار نہیں رہ جاتا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ایسا شخص شدہ شدہ اپنی ساری متاعِ نیاز غیر اللہ ہی کے حضور ڈال دیا کرتا ہے۔

"عبدیت" اور "عبادت" کا یہ تصور اللہ تعالےٰ کی الوہیت سے تعلق رکھتا ہے، یعنی اس کے الٰہ ہونے کا مقتضا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ توحید کا عنوان ہے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ" (اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں) یہی وہ عبادت ہے، یا عبدیت اور عبادت کا یہی وہ تصور ہے جو خدا کی نگاہ میں محبوب اور مستحق اجر ہے، اسی عبدیت کا وہ اپنے بندوں سے مطالبہ کرتا ہے، اسی عبدیت کو وہ اپنے صالح اور برگزیدہ بندوں کی صفتِ امتیاز اور وجہ عزت قرار دیتا ہے اور

اسی کی تبلیغ و تذکیر کے لئے وہ اپنے پیغمبروں کو دنیا میں بھیجتا رہا ہے۔ اس کے بالکل برعکس اور بالمقابل عبد اور عبدیت کا پہلا مفہوم ایک ایسی چیز ہے جس کا رضائے الٰہی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ جیسا کہ اوپر گزر چکا، اس میں کافر اور مومن سب برابر کے شریک ہیں، اور اس مفہوم بندگی کی رو سے ایک کافر بھی اللہ کا ویسا ہی "عبد" ہے جیسا کہ ایک مومن۔

حقائق تشریعی و حقائق تکوینی میں فرق نہ کرنے کے نتائج

"عبادت" کے اِن دونوں مفہوموں میں جو فرقِ عظیم ہے اس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد وہ فرق بھی بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے جو حقائقِ تشریعی اور حقائقِ تکوینی کے درمیان، نیز ان دونوں کے علم و اعتراف کے درمیان ہے۔ تشریعی یا دینی حقائق تو وہ امور ہیں جن کا تعلق اللہ تعالےٰ کی اطاعت و عبادت اور شریعت سے ہے، جو اس کی رضا کا ذریعہ ہیں، اور جن کے ماننے والوں کو وہ اپنی دوستی اور ولایت کی سندِ افتخار عنایت کرتا ہے۔ اور حقائقِ تکوینی وہ امور ہیں جن کا تعلق اولیاء الشیطان سے بھی اسی قدر ہے جس قدر کہ اولیاء الرحمٰن سے ہے، یعنی اگر ایک شخص محض انہی حقائق کے تسلیم کر لینے پر اکتفاء کرتا ہے اور اُن سے آگے بڑھ کر حقائقِ تشریعی کا علم و یقین بھی عملاً اپنے اندر نہیں پیدا کر لیتا، تو وہ پیروانِ ابلیس کے زمرہ میں شامل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص صرف حقائقِ تکوینی ہی کے تسلیم کر لینے اور محض انہی کے مطابق اپنی زندگی کا نظام چلانے پر اکتفا تو نہیں کرتا بلکہ حقائقِ دینی کو بھی مانتا ہے۔ مگر پوری طرح نہیں بلکہ بعض امور میں تو وہ ان حقائق کی روشنی قبول کرتا ہے اور کچھ دوسرے امور میں ان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتا ہے

...... تو ایسا شخص ادھورا مومن ہے اور خدا کا ناقص پرستار ہے، اس کے ایمان میں اسی قدر کمی اور نقص ہے جس قدر کہ وہ حقائقِ دینیہ کے اتباع سے گریز کرتا اور علمی یا عملی طور پر ان کا انکار کر رہا ہوتا ہے۔

یہ ایک اہم تشریعی نکتہ اور بڑا ہی نازک مقام ہے، جہاں کتنوں ہی کے قدم حق کی شاہ راہ سے دور جا پڑے ہیں۔ خصوصاً اہل سلوک اس مقام پر اکثر سخت اشتباہات سے دوچار ہوتے رہے ہیں اور ایسے بے شمار شیوخ طریقت نے یہاں ٹھوکریں کھائی ہیں جنکو تحقیق حق کا امام اور توحید و معرفت الہٰی کا رازدان کہا جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :۔

> بہت سے لوگ ہیں کہ جب وہ قضا و قدر کے پاس پہنچے (یعنی انھیں ارادۂ الہٰی کا عرفان نصیب ہوا) تو وہیں ٹھہر گئے۔ لیکن میرا حال یہ نہیں ہے بلکہ جب میں وہاں پہنچا تو میرے روبرو اس میں ایک کھڑکی کھلی اور میں نے قدر و ارادۂ الہٰی سے ــــ حق کے ساتھ اور حق کے لئے ــــ جنگ کی ــــ مرد وہ ہے جو قدر کا مقابلہ کرتا ہے، نہ کہ وہ جو اس کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے،،

شیخ ممدوح کا یہ فرمانا عین مدعائے شریعت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں امر فرمایا ہے اور جس کی اس کے رسول نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ لیکن بہتیرے یہاں پہنچ کر بھٹک جاتے ہیں اور سر رشتۂ حق ان کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور یہ اس طرح پر کہ جب کبھی وہ سلوک کی منزلیں طے کرتے

ہوئے قضائے الٰہی کے قریب جا پہنچتے ہیں اور وہاں اُن گناہوں اور معصیتوں کا ـــــ حتیٰ کہ شرک اور کفر جیسی معصیتوں کا ـــــ مشاہدہ کرتے ہیں، جو ان پر یا دوسروں پر مقدر ہو چکی ہوتی ہیں اور انھیں نظر آتا ہے کہ ان معصیتوں کا سرزد ہو جانا اللہ تعالےٰ کی مشیت اور قضا کی رو سے ایک طے شدہ بات ہے۔ یعنی وہ اس کی ربوبیت کے فیصلوں اور مشیت کے تقاضوں میں (نہ کہ اس کی رضا کے تقاضوں میں) داخل ہیں ـــــ تو ان کی عقل و فہم پر یہ خیال غلبہ پا لیتا ہے کہ بس اب یہ جو کچھ قضائے خداوندی میں طے ہو چکا ہے، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا بلکہ اس پر راضی ہو جانا ہی دین، شریعت اور عبادت و طریقت ہے۔ لیکن ذرا غور تو فرمایئے، کتنا خطرناک ہے یہ خیال، جو اُن مشرکین کے خیالات سے کسی طرح بھی مختلف نہیں۔ جن کا کہنا تھا کہ :۔

لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۔ (انعام)	اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم، نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے، اور کسی چیز کو حرام ٹھیراتے۔
لَوْ شَاۗءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ (زخرف)	اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان بتوں کو نہ پوجتے۔
اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ (یٰسین)	کیا ہم انھیں کھلائیں جن کو اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا۔

یقیناً اگر ان لوگوں کو ہدایت کی روشنی نصیب ہوتی تو انھیں معلوم ہوتا کہ ایمان بالقدر اور تسلیم و رضا کا وہ مطلب ہرگز نہیں ہے جو خیرہ نگاہی کے باعث

انھوں نے سمجھ رکھا ہے، بلکہ یہ ہے کہ ہم پر جو مصیبت بھی پڑے ہم اُس پر صبر کریں اور یہ یقین کر کے، کہ یہ خدا ہی کی طرف سے ہے جس کا ہم پر نازل ہونا ناگزیر تھا، اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر جائیں، جیسا کہ قرآن میں ہے

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ۔ (تغابن)	جو مصیبت بھی کسی کو پہنچی وہ اللہ ہی کے حکم سے پہنچی، اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو راہ راست سجھا دیتا ہے

بعض علمائے سلف کی تفسیر کے مطابق " مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ " میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کے اندر مصیبتوں کے وقت یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ سارے آزار خدا ہی کی طرف سے ہیں، پھر ان مصیبتوں پر جزع فزع کرنے کے بجائے ان کے قلب پر صبر و رضا کا سکون چھا جاتا ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا جاتا ہے کہ:۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ۔ (حدید)	زمین پر، اور خود تمہارے اپنے اوپر جو مصیبت بھی نازل ہوتی ہے وہ قبل اس کے کہ ہم اس کو عالم وجود میں لے آئیں، ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہوتی ہے، بیشک یہ بات اللہ کے لیے (ذرا بھی) دشوار نہیں۔ (اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو) تاکہ تمہیں نہ تو کسی چیز کے

ہاتھ آنے کا افسوس ہو، نہ کسی چیز کے اس کی طرف سے مل جانے کی از حد خوشی۔

صحیح بخاری اور مسلم دونوں کی روایت ہے کہ " حضرت آدمؑ اور موسیٰ

میں مباحثہ ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "آپ وہی آدمؑ ہیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا اور آپ کے پتلے میں اپنی روح پھونکی، فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور تمام چیزوں کے "اسماء" کا آپ کو علم بخشا، پھر آپ نے ہمیں اور خود اپنے کو جنت کی نعمتوں سے کیوں نکال باہر کرایا؟" حضرت آدمؑ نے جواب دیا "آپ وہی موسیٰ ہیں جنکو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام سے نوازا اور اپنے پیغام کا حامل اور مبلغ بنایا اور شرفِ نبوت عطا کیا، تو کیا آپ کو معلوم ہے (یا نہیں) کہ یہ بات میرے حق میں میری آفرینش سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھی؟ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا "ہاں (یہ تو صحیح ہے)"۔ مباحثہ کی یہ روداد بیان کر چکنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے فرمایا کہ "اس مباحثہ میں حضر آدم نے حضرت موسیٰ کو قائل کر دیا۔"

دیکھو، حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اپنے کو بے قصوار ٹھیرانے کے لئے قضا و قدر کا نام نہیں لیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قضا و قدر سے استدلال کرنا جاہل اور معصیت پیشہ لوگوں کا کام ہے، نہ کہ کسی مومن مسلم کا۔ اور یہ اس لیے کہ اگر یہ چیز کسی گناہ کے لیے عذر ہو سکتی ہے تو ہر کافر اور عاد و ثمود جیسی کسی گمراہ اور مغضوب قوم حتیٰ کہ ابلیس تک کو اس بنا پر معذور سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے جو کچھ کیا مشیت الٰہی کے مطابق کیا

پھر حضرت موسیٰؑ کے اسلوبِ اعتراض پر بھی غور کرو کہ انھوں نے حضرت آدم کو ان کے ارتکاب گناہ پر کوئی ملامت نہیں کی۔ کیونکہ ان کا یہ گناہ بارگاہ الٰہی سے بخشا جا چکا تھا اور وہ مغفرت، ہدایت اور نبوت کے سہ گونہ انعامات سے سرفراز

ہو چکے تھے۔ بلکہ ان کو ملامت اس مصیبت کی بنا پر کی جو (بظاہر) ان کی اس لغزش کی وجہ سے تمام بنی نوعِ انسان پر نازل ہوئی اور انھوں نے حضرت آدم سے صرف یہ کہا کہ "آپ نے ہمیں جنت سے کیوں نکالا" جس کا جواب بھی حضرت آدم نے وہی دیا جو دینا چاہیے تھا کہ "یہ بات تو میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی طے ہو چکی تھی" یعنی یہ لغزش، اور اس لغزش کی یہ سزا دونوں ہی نوشتۂ ازل میں مقدر تھیں، اور جو مصائب مقدر ہو چکے ہوں انھیں ان کے واقع ہو جانے پر صبر کے ساتھ جھیل لے جانا ضروری ہے، کیونکہ اللہ کو اپنا رب ماننے کا یہی معیار ہے، اسی کا نام تسلیم و رضا ہے، اور یہی کمالِ ایمان کا مقتضا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بار بار اس چیز کا مطالبہ کیا ہے :۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ (مومن)	پس (مصائب پر) صبر کرو (اور یقین رکھو کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی معافی مانگو۔
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ؕ (آلِ عمران)	اگر تم صبر سے کام لو گے اور خدا سے ڈرتے رہو گے تو ان (اعدائے دین) کی چالیں تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی۔
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آلِ عمران)	اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

اِنَّہٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ   اس میں شک نہیں کہ جو خدا سے ڈرتا ہو

لَا یُضِیعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (یوسف ۔ ۱۰) اور وہ صبر پر کاربند رہتا ہے تو بلا شبہ (اس کے لئے کامیابی ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

غرض مصائب کے وقت ایک مومن کا فرض یہی ہے کہ وہ صبر اختیار کرے۔ اسی کا نام ایمان بالقدر اور تسلیم و رضا ہے۔ اس کے برعکس معاصی کے بارے میں اس کا فرض یہ ہے کہ ان پر صبر کرنے اور خوشی کے ساتھ انھیں کرتے رہنے کے بجائے ان سے پوری نفرت کے ساتھ دور بھاگے، ان کے سامنے سپر انداز ہونے کے بجائے ان سے برسرِ پیکار رہے، اگر کبھی دامن ان سے آلودہ ہو جائے تو خدا کے سامنے توبہ و استغفار کے آنسوؤں سے اُسے پاک کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح اگر وہ دوسروں کو خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا پائے تو اس وقت بھی اس پر ایسا ہی ایک فرض عائد ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ اپنی طاقت بھر انھیں ان سے روکنے کے لئے کمربستہ ہو جائے، جہاں کہیں بھی برائی نظر آئے اُسے مٹانے کی جدوجہد کرے، اور اس کے پشت پناہ ہوں، ـــــ یعنے کفار اور منافقین ـــــ سے خدا کے لیے جنگ کرے، نیکی اور معروف کو محبت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک رہے، اللہ کے دوستوں کو دوست رکھے، اور اس کے دشمنوں کو دشمن سمجھے، اللہ ہی کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے دشمنی، اور اس سلسلے میں نسل و خاندان اور قوم و وطن کے تمام رشتوں کو فراموش کر دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوْا اے ایمان لانے والو! میرے اور اپنے

عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاکُمْ ...... قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔

(ممتحنہ)

دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، تم ان کو محبت کا پیغام بھیجتے ہو حالانکہ وہ اس حق کا کھلم کھلا انکار کر چکے ہیں جو تمہارے پاس آیا ہے اور رسولؐ کو، نیز تم سب کو، تمہارے اپنے گھر بار سے نکال دیتے ہیں ...... تمہارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں (کے سوانح حیات) میں ایک عمدہ نمونۂ عمل موجود ہے، یاد کرو اس وقت کو جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم سے اور تمہارے معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو، ہم بری اور بے تعلق ہیں، ہم تمہارا (یعنی تمہارے مسلک کا) انکار کرتے ہیں، ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے دشمنی اور بغض ظاہر ہو چکا ہے، یہاں تک کہ تم تنہا اللہ پر ایمان لاؤ۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔

تم کسی گروہ کو، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، ایسا نہ پاؤ گے کہ وہ ان لوگوں سے رشتۂ مودت رکھتا ہو، جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہیں خواہ وہ ان لوگوں کے اپنے ہی باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان والے کیوں نہ ہوں، یہی لوگ ہوتے ہیں جن

کے دلوں میں اللہ نے ایمان پیوست کر دیا ہوتا ہے اور اپنی جناب سے ایک "روح" سے ان کی مدد کر رکھی ہوتی ہے۔

غور کرو، اگر کفر و نفاق کی معصیتوں میں گرفتار رہنے والوں کے لیے قضا و قدر کا عذر واقعی کوئی عذر ہوتا تو پھر اُن سے اتنی شدید نفرت اور عداوت رکھنے کا حکم کیوں ہوتا؟ اور اگر ایمان بالقدر کا مطلب یہ ہوتا کہ جو برائیاں بھی عالمِ ظہور میں آتی ہیں وہ چونکہ مشیتِ الٰہی کے بموجب بہر حال ظہور پذیر ہونے والی ہوتی ہیں اس لیے ان کی مخالفت کے بجائے ان کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے، تو پھر اہلِ ایمان اور اہلِ کفر، اہلِ تقویٰ اور اہلِ فجور سب کو خدا کے یہاں یکساں ہونا چاہیے تھا، حالانکہ قرآن حکیم کہتا ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہے:۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ۔ (صٓ)	کیا ہم ایمان لانے اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں کو، دنیا میں بگاڑ پیدا کرنے والوں کے برابر کر دیں گے؟ یا متقیوں کو بدکاروں کے مساوی کر دیں گے؟
اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ (قلم)	تو کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟۔
اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ (جاثیہ)	کیا اُن لوگوں نے، جنہوں نے کہ برائیاں کمائی ہیں، یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم انھیں ان کے مثل کر دیں گے جو صاحبِ ایمان ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں؟

اس طرح کی ایک دو نہیں، بے شمار آیتیں قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اہل حق اور اہل باطل، اہل اطاعت اور اہل معصیت، اہل ہدایت اور اہل ضلالت، اہل تقویٰ اور اہل فجور کے درمیان مکمل تفریق کی ہے۔ اور ان دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کے (برابر نہیں بلکہ) بالمقابل رکھا ہے۔ لیکن جس شخص کی نگاہ صرف حقائق تکوینی تک پہنچتی ہے اور حقائقِ تشریعی کی معرفت تک اس رسائی نہیں ہوتی وہ ان دونوں مقابل گروہوں اور ان کی متضاد صفتوں کے مابین کوئی فرق نہیں کرتا اور دونوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کا ہم پلہ قرار دے دیتا ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن ایسے لوگ خود ہی اپنی اس نادانی کا حیرت کے ساتھ اظہار کریں گے:۔

تَاللّٰهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ (شعراء، ۵)	قسم اللہ کی، یقیناً ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جب کہ ہم تم (بتوں) کو پروردگارِ کائنات کا ہم پلہ قرار دیتے تھے۔

یہی نہیں، بلکہ اس جاہلانہ منطق نے بہتوں کو جہل وضلالت کی اس آخری سرحد پر پہنچا دیا ہے جس کے بعد گمراہی کی کوئی منزل باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے کائنات کی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کو خالقِ کائنات کا مساوی ٹھیرا دیا، اور ہر چیز کو اس اطاعت اور عبادت کا مستحق قرار دے دیا ہے جو صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کا حق ۔ اور یہ اس طرح پر کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ ہی ساری موجودات کا وجود ہے، یعنی وجودِ کائنات اور ذاتِ الٰہی دونوں ایک ہی حقیقت کے دو الگ الگ نام ہیں، اور ہم جسے اللہ کہتے ہیں وہ مخلوقات کے وجود سے

الگ اور ماسوا کوئی چیز نہیں۔ العیاذ باللہ۔ سوچو تو، اس کے بعد کفر اور الحاد کا اور کونسا مقام باقی رہ جاتا ہے؟

گویا اس خالص کافرانہ نظریہ کے قائلین منطقی طور پر ان دونوں معنوں میں سے کسی معنی میں بھی اپنی عبودیت کا اعتراف نہیں کرتے جن کی توضیح اور تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کی بناء پر تو وہ خود اپنے ہی کو خدا کہتے نظر آتے ہیں، جیسا کہ بہت سے ملحدین نے صراحتاً اس امر کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں عابد بھی ہیں اور ہمیں معبود بھی۔ حالانکہ یہ قول نہ تو حقائق دینی ہی کے اعتراف و مشاہدہ پر مبنی ہو سکتا ہے، نہ حقائق تکوینی کے اعتراف و مشاہدے پر۔ بلکہ کھلا ہوا جہل اور اندھا پن ہے۔ نصاریٰ کو خدا نے صرف اس بنا پہ کافر ٹھیرایا کہ وہ ایک انسان —— حضرت مسیح علیہ السلام —— کے متعلق حلول اور اتحاد کا عقیدہ رکھتے تھے، تو ان لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو کائنات کے ایک ایک ذرے کے بارے میں ایسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں؟

ان کے مقابل ان لوگوں کی راہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جن کے پاس خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اُن کا تصور اور یقین یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ ہر شے کا رب، ہر چیز کا مالک اور موجود کا خالق ہے، ایسا خالق جو تمام مخلوقات سے بالکل جدا اور مبائن حقیقت رکھتا ہے، وہ نہ تو کسی شے میں حلول کرتا ہے، نہ کسی چیز سے متحد ہوتا ہے، اور نہ اس کا وجود اور کائنات کا وجود ایک ہے —— اس نے اپنی اور اپنے پیغمبروں کی کامل اطاعت کا حکم دیا اور ہر طرح کی نافرمانی سے منع کیا ہے، وہ بگاڑ کو سخت ناپسند کرتا ہے، اپنے بندوں کو کفر و شرک کرتے دیکھ کر اس کے غضب کی انتہا نہیں رہتی۔ مخلوق کے لیے ضروری

ہے کہ اس کی عبادت میں ہر دم مصروف رہے، اس کے احکام بجالاتی رہے اور اس کے لیے اسی سے توفیق بھی مانگے، جیسا کہ قرآن مجید سکھاتا ہے :۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے توفیق اور مدد مانگتے ہیں۔ (فاتحہ)

اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سے منجملہ دیگر فرائض کے ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ خدا کے بندے اپنے مقدور بھر معروف کا حکم دیں، منکر کا سد باب کریں اور خدا کی راہ میں کفار اور منافقین سے جہاد کریں۔

پھر اس تصور اور یقین کے بعد وہ عملی طور پر میدان میں اتر آتے ہیں اور اللہ کے دین کو دنیا میں رائج کرنے کے لیے اپنی ساری قوتیں اور کوششیں صرف کر دیتے ہیں، اور اس راہ میں وہ اللہ ہی سے مدد بھی مانگتے ہیں، قضا و قدر کے نام پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں رہتے۔ یہ طلب اعانت اور توفیق طلبی ان مصائب کے سلسلے میں ان کے قلب کو ثبات بخشتی ہے جو انھیں اس راہ میں پیش آتے ہیں اور ان شدائد کا مقابلہ کرنے کی انھیں طاقت دیتی ہے جو آئندہ پیش آسکتے ہیں۔ اس کی مثال کھانا کھانے کی سی ہے۔ انسان کھانا کھاتا ہے تاکہ وہ اس خوراک سے اپنی موجودہ بھوک کا ازالہ کرے اور آئندہ کے لیے اپنے جسم کو وہ قوت بہم پہنچائے جو مستقل اشتہا کا دفاع اور مقابلہ کر سکے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرتا کہ تقدیر کے نام پر کھانا پینا چھوڑ دے۔ یہی حقیقت ہے جو ہمیں اس حدیث سے ملتی ہے جس میں آتا ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا وہ دوائیں جن سے ہم اپنا علاج کرتے ہیں، اور وہ تعویذ گنڈے، جن سے ہم جھاڑ پھونک کرتے ہیں، اور اسی طرح کی تمام

احتیاطیں اور تدبیریں جن کو ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں اختیار کیا کرتے ہیں، تقدیر الٰہی کو بدل سکتی ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "ھِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ" یہ سب چیزیں بھی تقدیر ہی کے تحت ہوتی ہیں۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "دعا اور بلا زمین اور آسمان کے درمیان دوچار ہوتی ہیں، اور آپس میں گتھم گتھا ہوجایا کرتی ہیں"۔ اس حدیث سے بھی اسی حقیقت کا سراغ ملتا ہے۔

یہ ہے ان لوگوں کے علم و اعتقاد اور سعی و عمل کا حال جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی بندگی کرتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں جن کا اوپر ذکر ہوا، سب کی سب عبادت میں داخل ہیں۔

جبریہ کی گمراہیاں اور ان کا علاج

جو لوگ حقائق تکوینی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس مشاہدہ کو حقائق دینی اور احکام شرعی کے اتباع سے مانع سمجھتے ہیں، یعنے ارادۂ الٰہی کے علم و مشاہدہ کو تکلیفِ شرعی کے ساقط ہوجانے کا موجب ٹھیرا لیتے ہیں، وہ ضلالت کے مختلف مراتب پر ہیں:۔

(۱) ان میں جو غالی قسم کے لوگ ہیں ان کے نزدیک تو یہ بالکل ہی عام اصول ہے، اور وہ ہر اس کام کے سلسلے میں قضا و قدر کا حوالہ دے دیتے ہیں جو ان سے خلافِ شرع سرزد ہوجاتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ نظریہ اور قول یہود و نصاریٰ کے اقوال ضلالت سے بھی زیادہ بدتر اور ملحدانہ ہے، اور بالکل مشرکین کے اقوال جیسا ہے۔ جو کہا کرتے تھے کہ "اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد شرک نہ کرتے اور نہ کسی شے کو اس کے حکم کے خلاف حرام ٹھیراتے" (سورۂ انعام، رکوع ۱۸) روئے زمین پر ان لوگوں

سے بڑھ کر کوئی متناقض رویہ اختیار کرنے والا نہیں پایا جاسکتا ۔ اور حقیقت تو یہ ہے
کہ جو شخص بھی کسی مسئلہ میں قضا و قدر سے استدلال کرتا ہے وہ تناقض کی راہ چلنے والا
ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ وہ کسی آدمی کے برے اور بھلے
ہر طرح کے اعمال پر اسے ایک ہی انجام کا مستحق قرار دے اور اس کے ہر فعل کو یکساں
پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے ۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اگر کوئی ظلم کرتا ہے یا کوئی ظالم عام لوگوں
کو آزار پہنچایا کرتا ہے ، یا کوئی شخص زمین میں فساد انگیزی کرتا ہے ، لوگوں کا خون بہاتا
ہے ، ان کی آبروریزیاں کرتا ہے اور اسی طرح کے دوسرے خطرناک اور وحشیانہ اقدامات
پر اتر آتا ہے تو یہی شخص ان ظالمانہ حرکتوں کی مخالفت پر تیار ہو جاتا ہے اور اس ظالم
اور مفسد کو ایسی دردناک سزا دینے پر تل جاتا ہے جو دوسرے ظلم پیشہ لوگوں کے لئے بھی
عبرت کا سامان بن جائے ۔ پس ایسے مواقع پر اس سے کہنا چاہیے کہ اگر قضا و قدر بھی کوئی
" حجت " ہے تو پھر تم کیوں کسی شخص کی کسی بری حرکت پر چیں بجبیں ہوتے ہو؟ ہر
شخص کو ، جو کچھ بھی وہ کرنا چاہے ، کرنے دو ، (کیونکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے قضا و قدر کے
تحت ہی کرتا ہے) ، اور اگر قضا و قدر کو یہاں تم حجت نہیں تسلیم کرتے تو پھر اپنے اصل
دعوے کو باطل سمجھ لو ۔

درحقیقت اس نظریئے کے ماننے والے عملی دنیا میں اس اصول کے قائل بالکل
نہیں رہتے اور اپنی بات پر جمتے نہیں ، بلکہ ان کی نگاہ ہمیشہ اپنے نفس کی خواہشوں پر
لگی رہا کرتی ہے ۔ جہاں کہیں نفس کی تمنا بر آری ہوتی ہوتی ہے وہاں تو اس اصول
کو اصول تسلیم کرتے ہیں ، اور جہاں کہیں صورت حال اس کے خلاف ہوتی ہے اس کو پس
پشت ڈال دیتے ہیں ۔ ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک صاحب علم نے کتنی موزوں

بات کہی ہے کہ "اطاعت کے موقع پر تو تم قدری ہوتے ہو اور معصیت کے موقع پر جبری۔ جس موقع پر جو مسلک بھی تمہاری خواہشِ نفس کے موافق دکھائی دیتا ہے۔ اسے قبول کر لیتے ہو"۔

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اس اصول کو عام نہیں قرار دیتے، بلکہ اس کے اطلاق میں "عوام" اور "خواص" کی تفریق کرتے ہیں۔ انھیں اپنی اس "تحقیق اور معرفت" کا بڑا غرہ ہے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ وہ شخص تو احکامِ شرعیہ کا مکلف ہے جو اپنے افعال کے متعلق یہ احساس رکھتا ہو کہ وہ خود اسی کے ارادہ اور اختیار کے تحت سرزد ہوتے ہیں، لیکن وہ لوگ شریعت کے مکلف نہیں ہوتے جن کو یہ نظر آتا ہو کہ ان کے تمام افعال خدا ہی کے پیدا کئے ہوئے ہوتے ہیں اور ان میں ان کے اپنے ذاتی ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ ان کے کرنے پر مجبور کئے ہوئے ہوتے ہیں اور اللہ ان کے اندر، یعنے ان کے احوال و افعال میں، اسی طرح اپنی منشاء کے مطابق تصرف کرتا رہتا ہے جس طرح کہ تمام متحرک چیزوں کو حرکت دیا کرتا ہے۔ غرض ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ تکلیفِ شرعی اس شخص سے ساقط ہو جاتی ہے جو ارادۂ الٰہی کا مشاہدہ حاصل کر لے چنانچہ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ حضرتِ خضر اسی مقام پر تھے۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا، اس گروہ کے اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ عوام اور خواص میں تفریق کرتے ہیں۔ عوام کو تو شریعت کا مکلف سمجھتے ہیں، اور خواص کو نہیں۔ پھر "عوام" اور "خواص" کی مختلف تعریفیں بیان کرتے ہیں کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو حقائقِ تکوینی کا مشاہدہ حاصل ہو جائے اور یہ نظر آجائے کہ بندوں کے تمام

افعال کا خالق خدا ہی ہے اور تمام کائنات محض اسی کے ارادہ اور مشیت کی تابع ہے ان کے سر سے تکلیفِ شرعی ساقط ہو جاتی ہے، اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ جو کوئی اس حقیقت کو صرف جانتا ہے، دیکھتا نہیں، اور بن دیکھے اُس پر ایمان رکھتا ہے وہ تو احکام شرعی کا مخاطب ہے، اس کے سر سے تکلیف شرعی ساقط نہیں ہوتی، مگر جو شخص اس حقیقت کا شہود حاصل کر لے اور اُسے آنکھوں سے دیکھ لے، وہ دینی احکام کا پابند نہیں رہ جاتا۔ اس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ مشیتِ خداوندی کے جبر کو اور قضا و قدر کے فیصلوں کو تکلیف شرعی کا مانع قرار دیتے ہیں۔ اس وہم بلکہ خطرناک گمراہی میں ایسے ایسے لوگ گرفتار ہو گئے ہیں جنکو تحقیق و معرفت کا مردِ میدان اور توحید کا رمز شناس کہا جاتا ہے۔ ان کی اس لغزشِ فکر کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ سوچنے اور سمجھنے سے قاصر رہ گئے کہ بندہ کو اُس امر کا بھی حکم دیا جا سکتا ہے جس کی خلاف ورزی کرنا اس کے لیے ارادہ الٰہی میں متعین اور مقدر ہو چکا ہو۔ معتزلہ اور ان کے علاوہ دوسرے قدریہ کا ذہن بھی انہی کی طرح اس حقیقت کے ادراک سے عاجز ہو گیا تھا۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ نے احکامِ شریعت کی پابندی تو ہر شخص کے لیے ضروری قرار دی اور کسی کے حق میں بھی وہ تکلیف شرعی کے ساقط ہونے کے قائل نہیں ہوئے۔ مگر جہاں تک قضا و قدر کا، یعنی اس بات کا تعلق ہے کہ اللہ کی مشیت ہر چیز کو محیط ہے اور بندوں کے اعمال اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں، انھوں نے اسکا انکار کر دیا اور اُن کے مقابلہ میں اِن لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے قضا و قدر کا تو اقرار کیا مگر تکلیف شرعی کے ہر شخص کے حق میں عام ہونے کا ـــــــ کیونکہ مطلق انکار ان کے لیے کسی طرح ممکن نہ تھا ـــــــ انکار کر دیا اور اُن لوگوں کے سر سے اُس کو ساقط سمجھ لیا جنکو قضا و قدر کا مشاہدہ

نصیب ہو جائے۔ غور کرو تو نظر آئے گا کہ ان حضرات کا قول، معتزلہ کے قول سے زیادہ خلافِ حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف میں کوئی بھی اس بات کا قائل نہ تھا۔

ان لوگوں کے نزدیک شریعت کے احکام صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو حقائقِ تکوینی کے مشاہدہ سے بے بہرہ ہیں، اور جو اس منزل تک جا پہنچے ہیں ان کو یہ لوگ احکامِ شریعت کی پابندیوں سے ماورا، اور حق تعالیٰ کے زمرۂ خواص میں سمجھتے ہیں۔ اپنے اس قول کی تائید میں یہ لوگ اکثر آیت کریمہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (اور اپنے رب کی "یقین" کے آنے تک بندگی کر) کو پیش کیا کرتے ہیں، اور اس کی عجیب و غریب من گھڑت تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یقین" سے مراد یہی ارادۂ الٰہی کا علم و مشاہدہ ہے، لیکن یہ کھلا ہوا کفر ہے، اگرچہ اس قول کے بیشتر قائلین کو اس کے کفر ہونے کا شعور نہ تھا۔ کیونکہ اسلام کے اصول اور محکمات پر ایک نگاہ ڈالتے ہی ہمیں بدیہی طور پر دکھائی دیتا ہے کہ شریعت کے احکام کی پابندی ہر بندے پر جب تک کہ اس کے اندر عقل و تمیز موجود ہو، زندگی کے آخری لمحوں تک فرض ہے، اور وہ کسی شخص سے کبھی اور کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ پس جو شخص دین کے اس بدیہی اصول کو نہیں جانتا، اسے جتانا چاہیے اور تشریح کے ساتھ اس کو سمجھا دینا چاہیے۔ پھر اگر اس سمجھا دینے کے بعد بھی وہ تکلیفِ شرعیہ کے ساقط ہو جانے کے اعتقاد پر جما رہے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس قسم کے ملحدانہ اقوال اور اعتقادات کا اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کوئی وجود نہیں تھا۔ لیکن متاخرین کے یہاں اس طرح

کی باتیں کثرت سے پائی جاتی ہیں جو خدا اور اس کے رسول ؐ سے بغاوت اور عناد کے ہم معنی ہیں اور تکذیبِ انبیاء کے مرادف ۔ اگر ان باتوں کا کہنے اور اعتقاد رکھنے والا ان کی بطالت سے واقف نہیں ہے اور سمجھتا ہے کہ رسول ؐ خدا اور اولیاء اللہ کا یہی عقیدہ و مسلک رہا ہے تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ کوئی شخص یہ اعتقاد رکھے کہ نماز اس پر اس وجہ سے فرض نہیں رہی کہ اس کو وہ روحانی کمالات اور قلبی احوال حاصل ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس کو نماز کی کوئی ضرورت ہی نہیں ، یا یہ کہ شراب اس کے لئے اس وجہ سے حرام نہیں ہے کہ وہ ان بندگانِ خاص میں سے ہے ۔ جنھیں شراب نوشی کوئی روحانی مضرت نہیں پہنچا سکتی ، یا یہ کہ بدکاری اس کے لئے اس وجہ سے جائز ہے کہ وہ سمندر کی طرح ہو گیا ہے جس کو گناہوں کے خس و خاشاک گدلا نہیں کر سکتے ۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ وہ مشرکین ، جنہوں نے اللہ کے پیغمبروں کو جھٹلا دیا تھا اور ان کا رسول ؐ اور حکمِ الٰہی کے مطابق واجب الاطاعت ہونا تسلیم نہیں کیا تھا ، فکر کی دو اصولی غلطیوں میں مبتلا تھے ۔ ایک تو بدعت ، دوسری استدلال بالقدر ۔ وہ کبھی تو اُن بدعتوں (یعنی اپنے خانہ ساز نظریات) کو اپنی مذہبی زندگی کی اساس ٹھیراتے تھے جو شریعتِ الٰہی کے سراسر خلاف تھیں ، اور کبھی احکامِ الٰہی کی پابندی قبول کرنے کے خلاف قضا و قدر سے استدلال کیا کرتے تھے ۔

مشرکین کی یہی خصوصیات کسی نہ کسی رنگ میں ان لوگوں میں بھی موجود ہیں ، خواہ یہ خلافِ شرع بدعات کا ارتکاب کر رہے ہوں ، خواہ قضا و قدر سے استدلال کرتے نظر آئیں ، یا بیک وقت دونوں گمراہیوں کے حامل دکھائی پڑیں ، ہر حال میں

مشرکین سے ان کی اعتقادی مشابہت بالکل عیاں ہے۔ مشرکین کی مذکورہ بالا دونوں خصوصیتوں میں سے ایک خصوصیت، یعنی استدلال بالقدر، کے متعلق چند آیات قرآنی اوپر گزر چکی ہیں (اس لیے اس کی وضاحت اور تعارف کی یہاں کوئی ضرورت نہیں) رہی دوسری خصوصیت یعنی انکی بدعت پرستی اور شریعت سازی، تو اسکا بھی تذکرہ، اور پھر اسکی تردید قرآن مجید کے اندر دوسرے مقامات کے علاوہ سورۂ انعام اور اعراف میں بالتفصیل بیان کی گئی ہے، جہاں فرمایا گیا ہے کہ :۔

وَقَالُوا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَاۗءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَاۗءً عَلَيْهِ ۔

(انعام)

اور ان مشرکوں کا محض اپنے خیال کی بناپر یہ کہنا ہے کہ فلاں فلاں مویشی اور کھیتیاں ہیں جو عام استعمال کے لیے ممنوع ہیں، ان کو ان لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کھا سکتا جن کو ہم چاہیں، اور یہ کہ فلاں فلاں جانور ایسے ہیں جن کی پیٹھیں (سواری یا باربرداری کے لیے) حرام کردی گئی ہیں، اور کچھ خاص جانور ایسے ہیں جنھیں ذبح کرتے وقت وہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ (یہ لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں) تاکہ اللہ تعالی سے جھوٹ منسوب کریں۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ .... وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ....

اے اولاد آدم! شیطان تمہیں ہرگز اپنے فتنے میں مبتلا نہ کرنے پائے، جس طرح کہ تمہارے ماں باپ (آدم و حوا) کو اس نے جنت سے نکال باہر کیا تھا۔ ... اور جب یہ مشرکین کوئی کھلا ہوا گناہ کا کام کرتے ہیں

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ..... قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ...... قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ٥

(الاعراف)

تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہو (اے نبی) کہ اللہ فحش کا حکم نہیں دیا کرتا....... ان سے کہہ دو کہ میرے رب نے عدل کا حکم دیا ہے اور اس بات کا کہ تم ہر سجدہ ادا کرتے وقت اپنا رُخ (اسی کی طرف) سیدھا رکھا کرو..... کہو (یعنے ان سے پوچھو) کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی اس زینت جس کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کر رکھا ہے اور کھانے پینے کی پاک چیزوں کو کس نے حرام کر دیا ہے؟

...... انھیں بتا دو کہ میرے پروردگار نے تو حرام قرار دے رکھا ہے تمام کی تمام فحش باتوں کو، ان میں سے جو ظاہر ہیں، انھیں بھی اور جو چھپی اور ڈھکی ہیں ان کو بھی، ...... اور گناہ کے کام کو اور بلا حق کی زیادتی کو اور اس بات کو کہ اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھیراؤ جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی اور یہ کہ اللہ تعالےٰ کے متعلق ایسی بات کہو جس کا فی الواقع تمہیں کوئی علم نہ ہو کہ اس نے ایسا فرمایا ہے۔

پھر ستم یہ کہ ان لوگوں نے اپنی من گھڑت بدعات کو "حقیقت" کا نام دے رکھا ہے، جس طرح کہ اس قضا و قدر الٰہی کو جس کا انھیں مشاہدہ حاصل ہو جاتا

ہے "حقیقت" کہا کرتے ہیں۔ اور اس "حقیقت" تک پہنچنے کا راستہ ان کے نزدیک وہ "سلوک" ہے جس کا "سالک" اور راہرو شارع کے امر و نہی کا پابند نہیں رہتا، بلکہ اس پر پابندی جو کچھ ہوتی ہے صرف اپنے مشاہدہ اور ذوق و وجدان کی ہوتی ہے۔

قدریہ استدلال کا دعویٰ دراصل ایک فریب ہے جسے دوسروں کو خاموش کرنے کے لیے وہ استعمال کیا کرتے ہیں۔ ورنہ حقیقت واقعی یہ ہے کہ اس امر میں ان کا مرجع خود ان کے نفس کی خواہشیں اور ذہن کے تخیلات ہیں، اور خواہش پر مبنی ہی ان کے دین و مذہب کی اساس ہے۔ اس باب میں وہ ان بدعت پرست جہمیہ وغیرہ کلامیوں سے کسی طرح مختلف نہیں جو اپنے گھڑے ہوئے اور کتاب و سنت کے صریح مخالف اقوال کو "حقائق علمیہ" قرار دیتے ہیں، جن پر کہ ایمان و اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک اتنا ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں شریعت کی ثابت و محکم حقیقتیں بھی پس پشت ڈالی جا سکتی ہیں۔ ان کی خاطر کتاب اور سنت کے نصوص میں وہ یا تو تحریف کرتے ہیں، یا کھلم کھلا بالکلیہ ان سے اعراض برت جاتے ہیں۔ نہ انھیں سمجھتے ہیں نہ ان پر غور و فکر کرتے ہیں، بلکہ کہتے یہ ہیں کہ ہم ان کے معانی تک نہیں پہنچ سکتے، لہٰذا انھیں خدا کے حوالہ کرنا چاہیئے۔ حالانکہ اپنے ان عقائد پر جو ان نصوص شرعیہ کے خلاف ہیں، پوری آزادی سے یقین رکھتے ہیں۔ جبکہ ایک موٹی عقل کا آدمی بھی انھیں سن کر صاف سمجھ سکتا ہے کہ وہ اصول اسلام کے بالکل خلاف ہیں، مگر یہ ہیں کہ قرآن و سنت کے محکمات تک کو علم الٰہی کے حوالے کر کے ہر طرح کی آزادی اور بے قیدی حاصل کیے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے ان نام نہاد "حقائق علمیہ" کی عقلیت کا حال یہ ہے کہ اگر انھیں صحیح علم و عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ سارے کے سارے مجموعہ جہل و خرافات

ہی نظر آئیں گے۔ بعینہٖ یہی حال ان "سالکین" کا ہے۔ اگر ان کے ان مخالف شرع اقوال و اوہام کی چھان بین کی جائے، جنکو وہ اولیاء اللہ کے حقائق گمان کرتے ہیں، تو وہ سب کے سب ان کے اپنے جی کی گھڑی ہوئی باتیں اور نفس کی خواہشیں ثابت ہوں گے، جنکا اتباع خدا کے باغیوں اور دشمنوں کا کام ہے نہ کہ اس کے دوستوں کا یہ لوگ حق کی شاہراہ سے کیوں دور جا پڑے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے۔ راہ حق سے انحراف کی موجب صرف ایک چیز ہے، اور وہ یہ کہ انسان خدا کے نازل کیے ہوئے نصوص پر اپنے قیاس کو مقدم قرار دے لے اور امر الٰہی کو چھوڑ کر اپنے جی کا تابع بن جائے۔ کیونکہ ہر شخص کا ذوق اپنے مخصوص طبعی میلانات ہی کے مطابق ہوتا ہے۔ محبت اور میلان سے کوئی دل خالی نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ایسی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جیسی اور جس قسم کی کسی شخص کے دل میں محبت ہوگی، اسی کے مطابق اس کا مذاق اور وجدان بھی ہوگا۔ مثلاً اہل ایمان کا ایک خاص ذوق اور وجدان ہوتا ہے جو دوسروں کے اندر نہیں پایا جا سکتا، اور جس کی تصویر کچھ اس حدیث صحیح کے اندر دیکھی جا سکتی ہے جس میں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ :-

"جس شخص کے اندر تین چیزیں موجود ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت سے بہرہ ور ہوگا :- ایک تو یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو ہر شے سے زیادہ محبوب ہوں، دوسری یہ کہ جس شخص کی بھی وہ محبت کرے صرف اللہ ہی کے لئے کرے، تیسری یہ کہ کفر سے نکل آنے کے بعد پھر دوبارہ اس میں لوٹ جانے کو اتنا ہی برا اور ناپسندیدہ سمجھے جتنا کہ وہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے"

اسی طرح کی ایک اور حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :-

"ایمان کا مزہ اسی نے چکھا جو اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمدؐ کو اپنا پیغمبر تسلیم کر کے دل سے خوش ہو۔"

اسی طرح کافروں، بدعتیوں اور خواہش پرستوں میں سے بھی ہر ایک کا، اس کی خواہشوں اور محبتوں کے مطابق، ایک مخصوص وجدان ہوتا ہے۔ سفیان ابن عینیہؒ سے پوچھا گیا یہ کیا بات ہے کہ وہ لوگ جن کا دین و ایمان صرف ان کی خواہشاتِ نفس ہوتی ہیں، وہ بھی اپنی ان بے حقیقت باتوں سے شدید محبت رکھتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کیا تمہیں اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد نہیں کہ وَاُشْرِبُوْا فِی قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ (اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پیوست کر دی گئی) یہی حال بت پرستوں کا ہے انھیں بھی اپنے بتوں سے ایسی ہی گہری محبت اور عقیدت ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورہ بقرہ)

لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو غیر اللہ میں سے اللہ کا ہم سر بنائے ہوئے ہیں، جن سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ کی کی جانی چاہیے، اور مومنوں کا حال یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ ہی سے محبت کرتے ہیں۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى

پس اگر یہ لوگ تمہارا جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ صرف اپنے نفس کی خواہشوں کے پیرو ہیں۔ اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون

مِنَ اللّٰہِ ۔ (سورۂ قصص)

ہوگا جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کرے؟

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَھْوَی الْاَنْفُسُ، وَلَقَدْ جَآءَھُمْ مِّنْ رَّبِّھِمُ الْھُدٰی۔ (سورۂ نجم)

یہ لوگ صرف اپنے گمان اور اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کرتے ہیں، حالانکہ ان کے رب کے پاس سے ان کے یہاں ہدایت آچکی ہے۔

معلوم ہوا کہ ہر شخص کا وجدان اور میلانِ طبع اس کے مخصوص اعتقاد کے زیرِ اثر ہوا کرتا ہے، اور مجردِ وجدان کو حقائق کی طرف رہنمائی کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ان نام نہاد اہلِ سلوک کا، جن کے طرزِ استدلال سے ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں، یہی حال ہے۔ ان کے اعتقادات اور اعمال کا قبلہ نما خود ان کا اپنا ذوق اور اپنی خواہشِ نفس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ عموماً راگ باجے کے بڑے شیدا ہوا کرتے ہیں، جس کا نفسِ انسانی پر اثر صرف یہ ہوا کرتا ہے کہ اس سے محبتِ مطلقہ کے جذبات ابھر آتے ہیں، وہ محبتِ مطلقہ، جو صرف اہلِ ایمان ہی کے اندر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں خدا پرست، بت پرست، نسل پرست، وطن پرست، قوم پرست، زن پرست اور امرد پرست سب ہی برابر کے شریک ہیں۔ کیونکہ محبت سے تو کوئی دل بھی خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے جس کے دل میں جو محبت ہوگی نغموں کی گرمی اسی کے شعلوں کو تیز تر کرے گی۔ حقیقتِ واقعی یہ نہیں ہے کہ نغمہ و سرود صرف محبتِ ایمانی ہی کو گرمایا کرتا ہو اور دوسری محبتوں کو نہ اکساتا ہو۔

یہ لوگ اپنے وجدان اور مذاق کے ایسے فدائی ہوتے ہیں کہ قرآن و سنت کی

ہدایات کو ان کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں دیتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس عبادت الٰہی کی تبلیغ کی خاطر خدا کے پیامبر دنیا میں آئے تھے اور جس طاعت خداوندی کی تلقین انبیاء کرام کی بعثت کا تنہا مقصد تھا اس کا مخالف دینِ حق کا پیرو نہیں ہو سکتا۔ وہ پیرو تو در اصل اپنی خواہش نفس کا ہوتا ہے۔

(۳) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اس طائفہ میں سب سے زیادہ قدر و منزلت کے مالک ہیں۔ یہ لوگ عام فرائضِ دینی کے بجا لانے اور محرمات سے دور رہنے میں تو احکامِ الٰہی کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ لیکن غلطی یہ کرتے ہیں کہ اس عالم اسباب میں رہتے ہوئے "اسباب" کی طرف توجہ نہیں کرتے اور انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ "اسباب" بھی در اصل عبادت ہی ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کی بنیاد اس کا یہ گمان ہے کہ جب کوئی عارفِ کامل قضا و قدر کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو پھر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اُسے جد و جہد کی چنداں حاجت نہیں رہتی۔ چنانچہ ان لوگوں میں سے بعضوں کا تو صاف صاف فرمانا ہے کہ توکل (یعنی کسی امر میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر کے انجام کار کو خدا کے سپرد کر دینا) اور دعا اور اسی طرح کے دوسرے ایمانی اوصاف، اللہ کے خاص بندوں کے مقامات نہیں ہیں، بلکہ یہ تو عوام کے مقامات ہیں۔ کیونکہ جو شخص قضا و قدر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا اس کو تو معلوم ہی ہو گیا کہ فلاں چیز صحیفہ تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اور فلاں وقت ظہور میں آ کر رہے گی، پھر اس کے لیے سعی و جہد کی کیا ضرورت باقی رہی ہے۔ لیکن یاد رہے یہ ایک بڑی بھاری غلطی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو ان کے اسباب کے تحت اور ان کے ساتھ ہی مقدر فرمایا ہے کہ ان سے الگ۔ جس طرح کہ سعادت و شقاوت

اپنے اسباب کے ساتھ مقدر کی گئی ہیں، جیسا کہ مخبر صادق ؑ نے ہمیں بتایا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو جنّت کے لیے پیدا کیا ہے، اور اُن کے لیے اس وقت سے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پیٹھ ہی میں تھے جنّت پیدا کر رکھی ہے، اور وہ عمل بھی اہلِ جنّت کا سا کرتے ہیں، اسی طرح کچھ لوگوں کی تخلیق دوزخ کے لیے ہوئی ہے اور دوزخ ان کے لئے اس وقت سے مہیا فرما رکھی گئی ہے جب کہ وہ ابھی پُشتِ آباء ہی میں تھے، اور عمل بھی اہلِ دوزخ جیسا کرتے ہیں"۔

دوسری حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو یہ حقیقت سنائی کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر شے کی تقدیر لکھ رکھی ہے" تو انھوں نے کہا "یا رسول اللہ تو کیوں نہ ہم عمل کرنا چھوڑ دیں اور نوشتۂ الٰہی پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہیں"؟ ہادی علیہ السلام نے جواب دیا:۔

"نہیں، ایسا نہ کرو، بلکہ عمل کرو، کیونکہ ہر شخص کے لیے اس کام کی راہ آسان کر دی جاتی ہے جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہوتا ہے۔ جو سعید ہے اس کے لیے ایک سعید جیسے اعمال کی، اور جو شقی ہے اس کے لیے اشقیاء جیسے کاموں کی راہ ہموار کر دی جاتی ہے"۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جن اسباب و ذرائع کے اختیار کرنے کی اپنے بندوں کو ہدایت فرمائی ہے وہ خود بھی عبادت کی حیثیت رکھتے ہیں، اور جہاں تک توکل کا تعلق ہے اس کا سرِرشتہ تو عبادت سے پوری طرح ملا ہوا ہے۔ ذیل کی آیاتِ قرآنی کے الفاظ اور اسلوبِ بیان پر غور کرو:۔

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ۔ (سورۂ ہود)

پس اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ رکھ۔

قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ۔ (سورۂ رعد)

کہو یہ میرا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کے حضور مجھے لوٹ کر جانا ہے۔

(۴) چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو دین کے واجبات کو تو ادا کرتے ہیں مگر مستحبات اور نوافل کا کوئی اہتمام نہیں کرتے۔ اس لئے قدرتاً اسی حساب سے ان کے درجات میں کمی اور پستی بھی آجاتی ہے۔

(۵) پانچویں قسم ان لوگوں کی ہے جو کشف و کرامت کی باطنی قوت پیدا کر لینے کی وجہ سے فریبِ نفس کا شکار ہو جاتے ہیں، اور عبادت کی ادائیگی سے بے پروائی اور شکرِ خداوندی کی بجا آوری سے بے نیازی اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ سب گمراہیاں، جن کا اوپر ذکر ہوا، اور اسی طرح کی بے شمار لغزشیں اہلِ سلوک کو راہِ سلوک میں اکثر پیش آیا کرتی ہیں۔ اور ان سے محفوظ رہنے کی صرف ایک ہی سبیل ہے۔ اور وہ یہ کہ بندہ ان تمام احکامِ الٰہی کی سختی کے ساتھ پابندی کرتا رہے جنھیں دے کر اس نے اپنے رسول کو دنیا میں مبعوث فرمایا ہے۔ امام زہری نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب یہ فرمایا تھا کہ "ہمارے اسلاف کہا کرتے تھے سنت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہنے میں نجات ہے"۔ فی الواقع یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں شک کا کوئی شائبہ بھی نہیں اور نہ اسے کبھی زوال ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سنت کی مثال بقول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، کشتیٔ نوح کی سی ہے، جو اس میں بیٹھا اس

نے نجات پائی، اور جو اس سے علیحدہ رہا وہ لازماً غرق ہوا۔

کتاب و سنت میں یہ جو "عبادت" "طاعت" "استقامت" "اور لزوم صراطِ مستقیم" وغیرہ مختلف الفاظ آتے ہیں ان میں فرق و اختلاف دراصل صرف نام اور تعبیر کا ہے، مسمّٰی اور مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔ اس مسمّٰی و مفہوم کا واقعی وجود دو چیزوں پر موقوف ہے:۔ ایک تو یہ کہ بندہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرے، دوسرے یہ کہ یہ بندگی بھی اسی کے نازل کیے ہوئے اور بتائے ہوئے طریقہ پر کرے، نہ کہ اپنے من مانے اور اپنے جی کے گھڑے ہوئے طریقوں پر۔ قرآن کی ان آیتوں میں بھی یہی رازِ ہدایت مستور ہے:۔

(۱) فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا۔ "سورہ کہف"

پس جو کوئی اپنے پروردگار کے روبرو حاضر ہونے کا کھٹکا رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ "صالح" عمل کرے اور اس کی معبودیت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

(۲) بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ۔ (سورۂ بقرہ)

کیوں نہیں! جس کسی نے بھی اللہ کے لیے اپنی پیشانی جھکائی اور "احسان" کی روش اختیار کرتے ہوئے جھکائی، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔

(۳) وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (سورہ نساء)

اس شخص کے دین سے کس کا دین بہتر ہوگا جس نے اللہ کے لیے اپنی گردن اچھی طرح ڈالدی ہو، اور جو یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقہ کی

تینوں آیتوں کو ایک دوسرے کی روشنی میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ پہلی آیت میں جس شے کو "عمل صالح" کہا گیا ہے، دوسری اور تیسری میں اُسی کو "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ عملِ صالح ہی کا دوسرا نام احسان ہے۔ احسان کے معنی ہیں "حسنات" کی بجا آوری، اور حسنات، ان چیزوں کو کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہوں، اور اللہ و رسول کی پسندیدہ چیزیں وہی ہیں جن کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ پس وہ بدعات، جن کی دین میں کوئی اصل و سند نہیں، اللہ اور رسول کو محبوب نہیں ہو سکتیں۔ اور جب وہ اللہ و رسول کو محبوب نہیں تو لازماً حسنات اور اعمالِ صالحہ میں سے بھی نہیں ہو سکتیں، جس طرح کہ وہ فواحش و منکرات حسنات اور اعمالِ صالحہ میں سے نہیں ہوا کرتے جن کا فسق و فجور ہونا بدیہی ہو۔

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا اور أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ کے ٹکڑوں میں اخلاصِ دین کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ یعنی خدا کی طاعت ایسی یکسوئی، بے آمیزی اور خلوصِ باطن کے ساتھ کی جانی چاہیے کہ اس کے دوران ماسوا کا دھندلا سا بھی وہم نہ گزرنے پائے۔ حضرت عمرؓ دعا مانگا کرتے تھے کہ:۔ "خدایا! میرے ہر فعل کو صالح اور اپنے ہی لیے خالص بنا، اور اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہ بننے دے"۔ فضیل بن عیاضؒ نے آیت لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ "احسن" کے معنی ہیں "اخلص" اور "اصوب"۔ پوچھا گیا "اخلص" اور "اصوب" کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا "عمل اگر خالص ہو لیکن صائب نہ ہو تو وہ اللہ کے حضور مقبول نہیں، اسی طرح اگر صائب تو ہو مگر خالص نہ ہو تو بھی مقبول نہیں۔ بارگاہِ الٰہی میں وہی عمل لائقِ پذیرائی ہے جو خالص بھی ہو اور صائب بھی: "خالص"

کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کے لیے ہو، اور "صائب" کا مدعا یہ ہے کہ سنتِ رسول کے مطابق ہو"۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ تمام اعمال و صفاتِ انسانی، جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں، حدودِ عبادت میں شامل ہیں تو پھر ایسا کیوں ہے کہ قرآن مجید میں بارہا لفظِ "عبادت" پر دوسرے اعمالِ صالحہ یا صفاتِ حسنہ کو عطف کیا گیا ہے؟ عطف تو اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ دونوں دو چیزیں ہیں نہ کہ ایک۔ مثال کے لیے چند آیتیں ملاحظہ ہوں:۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (فاتحہ)	خدایا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔
فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ۔ (ہود)	پس اسی کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ رکھ۔
اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ۔ (نوح)	اللہ کی عبادت کرو، اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

پہلی آیت میں لفظِ "عبادت" پر "استعانت" کو، دوسری میں "توکل" کو اور تیسری میں "تقویٰ اور اطاعتِ رسول" کو عطف کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ چیزیں جزءِ عبادت نہیں ہیں، بلکہ اس سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں۔

لیکن یہ اعتراض اس غلط مفروضہ پر مبنی ہے کہ عطف ہمیشہ مغایرت کی دلیل ہوتا ہے۔ خود قرآن ہی کے اندر بے شمار جملے ایسے موجود ہیں جو اس مفروضہ کی تغلیط

کرتے ہیں، مثلاً اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت)، میں
"فحشاء" پر "منکر" کا لفظ معطوف کیا گیا ہے۔ حالانکہ فحشاء، منکر میں داخل
اور اسی کا ایک جزو ہے، نہ کہ اس سے علیحدہ کوئی شے۔ اسی طرح آیت اِنَّ اللّٰہَ
یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی (نحل) میں "ایتاء ذی القربیٰ"
کو "عدل واحسان" پر عطف گردانا گیا ہے، حالانکہ قرابت داروں کی مالی اعانت
عدل واحسان ہی کی ایک صورت ہے۔ ایک اور مثال آیت وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ
بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (اعراف) کی لیجیے، جس میں "اقامتِ صلوٰۃ" کو
"تمسک بالکتاب" پر عطف کیا گیا ہے، جب کہ اقامت صلوٰۃ، تمسک بالکتاب
ہی کی ایک شکل بلکہ اس کا عظیم ترین مظہر ہے۔

ان شواہد سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عطف ہمیشہ مغایرت ہی پر
دلالت نہیں کرتا، بلکہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی ایک
لفظ ہوتا ہے جس کا مفہوم ایک اور لفظ کے مفہوم کا جزو ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود
اس پر عطف کر دیا جاتا ہے اور مقصد اس عطف کا یہ ہوتا ہے کہ اس طرح اس کی
خصوصیتِ ذکر کا اظہار ہو جائے۔ اسی طرح کبھی ایک لفظ ایسا ہوتا ہے جو مختلف
مواقعِ بیان میں مختلف معانی دیتا ہے۔ اگر وہ تنہا لایا جاتا ہے تو اس کے مفہوم میں
قدرتاً وسعت اور عمومیت ہوتی ہے، اور اگر کسی دوسرے لفظ کے ساتھ ملا کر لایا جاتا
ہے تو اس کا خاص اور محدود مفہوم رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "فقیر" اور "مسکین"
کے الفاظ کو لے لیجیے۔ یہی لفظ "فقیر" ہے جو آیت لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰہِ (بقرہ) میں تنہا آیا ہے، نیز یہی لفظ "مسکین" ہے جو آیت فَکَفَّارَتُہٗ،

اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ (مائدہ) میں تنہا استعمال ہوا ہے، اور اس لیے فقیر کے مفہوم پر بھی حاوی ہے، لیکن یہی دونوں الفاظ جب آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ (توبہ) میں ایک ساتھ آگئے تو دونوں کے الگ الگ اور محدود مفہوم ہوگئے اور دونوں کی علیحدہ علیحدہ قسمیں ہوگئیں۔

اس طرز بیان، یعنی ایک اسم عام پر اس کے کسی جزو خاص کو عطف کردینے میں مختلف مواقع پر بلاغت کے مختلف نکتے مدنظر ہوتے ہیں۔ کہیں تو اس اسم خاص کی کسی ایسی خاصیت اور شان کو نمایاں کرنا مقصود ہوتا ہے جو اسم عام کے دوسرے افراد میں موجود نہیں ہوتی۔ اور کہیں لفظ عام پر اطلاق اور اجمال کا پردہ پڑا ہوتا ہے، جس کے نیچے اس کی عمومیت اور وسعت کچھ چھپی چھپی سی ہوتی ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کے کچھ افراد سامع کے ذہن میں آنے سے رہ نہ جائیں۔ اس لیے اس کے بعد اسم خاص کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

اس اسلوب بیان اور اس اصولِ بلاغت کی مثالیں قرآن میں کثرت سے ملتی ہیں۔ چند آیتیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ بعض مثالیں ذرا کسی قدر توضیح کے ساتھ اور پیش کی جاتی ہیں:-

(۱) اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ۔ (عنکبوت) جو کچھ قرآن تمہارے اوپر وحی کیا گیا ہے اس کی "تلاوت" کرو اور نماز قائم کرو۔

یہاں "تلاوت کرو" کا مطلب محض زبان سے الفاظ کی ادائیگی نہیں، بلکہ اس کے احکام کا اتباع ہے۔ (جیسا کہ ابن مسعودؓ نے آیت اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی

ہے وہ اس کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے، یعنی یہ کہ اس کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حرام قرار دیتے اور اس کے حلال کو حلال سمجھتے ہیں، اس کی متشابہ آیتوں پر ایمان رکھتے اور محکم آیتوں پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھتے ہیں"] ظاہر ہے کہ "قرآن کے احکام" میں جن کے اتباع کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، پوری شریعت داخل ہے۔ اور نماز بھی اسی مجموعۂ شریعت کا ایک جزو ہے، لیکن اس کے باوجود اس آیت میں "تلاوتِ کتاب" پر "اقامتِ صلوٰۃ" کو عطف کر کے اس کو مخصوص اہتمام کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے، تاکہ اس کی اہمیت اور علوِ شان کی طرف نگاہیں اٹھ جائیں۔

(۲) اِتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا (سورہ احزاب) اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کہو۔

(۳) اِتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوا اِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (سورۂ مائدہ) اللہ سے ڈرو اور اس کے تقرب و رضا کے لیے ذریعہ مہیا کرو۔

غور فرمایئے ان آیتوں میں تقویٰ پر "قولِ سدید" اور "ابتغاء وسیلہ" کو عطف کیا گیا ہے، حالانکہ یہ چیزیں بجائے خود تقویٰ ہی کے تکمیلی اجزاء ہیں اور اسی کی فرع۔ لیکن انہی فوائد کے پیشِ نظر جن کی تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں، 'تقویٰ' کے عمومی حکم کے بعد ان کا خاص طور سے تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں اب ان آیتوں کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے جن کو اعتراضاً بطور مثال پیش کیا گیا ہے ان میں "عبادت" کے لفظ پر "توکل" "استعانت" اور "تقویٰ" کے الفاظ کو اگر معطوف کر کے لایا گیا ہے تو اس عطف کا منشاء یہ ہرگز نہیں کہ یہ چیزیں عبادت کے دائرے سے باہر ہیں، بلکہ یہ ہے کہ یہ چیزیں

اگرچہ عبادت ہی کے اجزاء ہیں، لیکن "عبادت" کے لفظ عام کے بعد ان کا ذکر خاص طور سے صرف اس لیے کردیا گیا ہے تاکہ عابد کی نگاہ میں ان کو ایک خاص شانِ امتیاز حاصل رہے اور وہ ان صفاتِ ایمانی کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر اتارتے رہنے کی فکر میں برابر ڈوبا رہے۔ کیونکہ یہ چیزیں بقیہ ساری عبادتوں کی صحیح صحیح بجا آوری میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور کوئی عبادت ان کی مدد کے بغیر ادا نہیں ہوسکتی۔

مخلوق کا معیارِ کمال

اس پوری تقریر سے یہ حقیقت اب بالکل بے نقاب ہو جانی چاہیے کہ انسان یا کسی بھی مخلوق کا کمالِ زندگی اسی عبودیت میں پوشیدہ ہے۔ جس بندہ کی عبودیت جتنی ہی زیادہ معیاری ہوگی اس کا درجہ اتنا ہی زیادہ اونچا اور قابلِ رشک ہوگا۔ اور جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ مخلوق کے لیے عبودیت کی منزل سے آگے نکل جانا ممکن ہے، یا کسی مخلوق کا کمال، عبودیت سے ماورا ہو جانے میں ہے، وہ جہل و گمراہی کے اس مقام پر ہے جس کے آگے ضلالت کی کوئی اور منزل باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ بحث کے آغاز میں متعدد آیات پیش کر کے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے مقرب ترین بندوں کا مداحانہ ذکر کرنا چاہتا ہے تو انھیں "عبد" کے نام سے یاد کرتا ہے اور ان کی "عبادت" ہی کو ان کی صفتِ امتیاز اور وجہ افتخار قرار دیتا ہے، اسی طرح جب کسی کی مذمت کرنی ہوتی ہے تو اس پر یہی فردِ جرم لگاتا ہے کہ اس نے اپنی عبدیت کا حق ادا نہیں کیا اور میری عبادت سے رد گرداں رہا۔ نیز ایک سے زائد نصوصِ قرآنی کے حوالے سے اس امر کو بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھی دنیا میں بھیجے انھیں اس نے اسی حکمِ عبادت کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور ہر پیغمبر نے اپنی دعوت کی ابتدا اُعْبُدُوا اللّٰہَ

کے الفاظ سے کی تھی۔

عبدیت کے لحاظ سے لوگوں میں فرق مراتب

جب آپ پر "عبادت" کی یہ حقیقت روشن ہو چکی تو اب ایک نگاہ میں یہ بات بھی بدیہی طور پر محسوس ہو جانا چاہیے کہ اس مطلوب کے حصول میں لوگوں کے درمیان عظیم الشان فرق موجود ہے، اور یہ فرق دراصل ان کی ایمانی کیفیتوں کے فرق کا مظہر یا اس کا دوسرا نام ہے۔ 'عبودیت' کے مقامات اور درجاتِ کمال کے لحاظ سے لوگ دو بڑے گروہوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ ایک خواص کا گروہ، دوسرا عوام کا گروہ۔ اور اسی بنا پر پروردگارِ عالم کی ربوبیت کی نسبت بھی تمام لوگوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتی، بلکہ ضروری ہے کہ اس کے بھی درجے مختلف ہوں، کہیں یہ نسبت معمولی قسم کی ہوگی تو کہیں مخصوص اور معیاری قسم کی۔ اس سلسلہ میں حد یہ ہے کہ توحیدِ خالص اور حقیقی عبودیت کی علمبردار امت بھی شرکِ خفی کے کم از کم باریک ترین جراثیم سے محفوظ نہیں رہ سکی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے ہیں:۔

تعس عبد الدرہم تعس عبد الدینار تعس عبد القطیفۃ تعس عبد الخمیصۃ تعس وانتکس واذا شیک فلا انتقش اذا اعطی رضی واذا منع سخط (صحیح بخاری)

ہلاک ہوا بندۂ درہم، ہلاک ہوا بندۂ دینار، برباد ہوا مخملیں چادر کا غلام، تباہ ہوا سیاہ چوکور کپڑے کا پجاری، ہلاک ہوا وہ اور اوندھے منہ گرا۔ اس کا حال یہ ہے کہ جب اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو وہ نکلتا ہی نہیں (یعنے مصیبت پر مبتلا رہتا ہے) جب اسے کچھ مل جاتا ہے تو مگن ہو جاتا ہے،

اور اگر نہیں ملتا تو ناراض ہو بیٹھتا ہے۔

ترجمانِ حقیقت کے ان الفاظ پر غور کرو کہ آپ کس طرح متاعِ دنیوی کے پیچھے پڑنے والے کو عبدالدرہم اور عبدالدینار جیسے الفاظ سے یاد کر رہے ہیں، اور دعائے بد کے طور پر چند کلمات ارشاد فرماتے ہیں تو ساتھ ہی ایک تمثیلی اسلوب میں اس کی زرپرست فطرت کا مرقع کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی خوشی اور ناخوشی کا دارومدار صرف مال پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی انسانی فطرت کی اس کمزوری کی نشاندہی کی گئی ہے:۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ٥ (توبہ)	ان منافقوں میں سے بعض ایسے ہیں جو صدقات کی تقسیم کے بارے میں تم پر معترضانہ اشارے کرتے ہیں، اگر اس میں سے انھیں کچھ دے دیا جاتا ہے تو خوش رہتے ہیں، اور اگر کچھ نہ دیا جائے تو معاً ناراض ہو بیٹھتے ہیں۔

غرض ان کا خوش ہونا اللہ کی رضا نہیں بلکہ کسی اور ہی چیز پر منحصر ہوتا ہے اور یہ چیز ان کی اپنی خواہشوں اور دنیوی لذتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ حالانکہ بندے کی بندگی کا تقاضا ہے کہ اپنی رضا و عدم رضا کو رضائے الٰہی کا پابند بنائے رکھے۔ ورنہ وہ بندگی کے ادعا کے باوجود اس کے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔ وہ زبان سے خدا کا بندہ ہوگا، مگر دل مال و زر کی بندگی میں مصروف ہوگا۔

یہی حال اس شخص کا بھی ہوتا ہے جو کسی اقتدار پر، یا کسی حسین صورت پر یا اسی طرح کی کسی اور چیز پر مفتون ہو، وہ بھی مال و زر کے پجاری ہی کی طرح، اگر اپنی مطلوبہ شے کو پا لیتا ہے تو سکون و مسرت میں سرمست ہو جاتا ہے، اور اگر ناکام و نامراد

رہ جاتا ہے تو اسی غم میں گھلتا رہتا ہے، اس لئے اگر مذکورہ بالا شخص، حسب ارشاد نبوی، مال و دولت کا غلام ہے تو یہ بھی اپنی محبوب شے کا بندہ اور غلام ہی کہا جائے گا، کیونکہ بندگی اور غلامی درحقیقت دل کی بندگی و غلامی ہوتی ہے جو چیز بھی دل کو اپنا غلام بنا لے انسان صحیح معنوں میں اسی کا بندہ اور غلام ہو جاتا ہے۔ اس شخص نے کتنی عمدہ بات فرمائی ہے جس نے کہا ہے ؎

العبد حر ما قنع	والحر عبد ما طمع
غلام میں اگر قناعت ہے تو آزاد ہے	اور آزاد اگر لالچی ہے تو غلام ہے

یہی بات ایک اور شاعر ان لفظوں میں کہتا ہے ؎

اطعت مطامعی فاستعبدتنی	ولو انی قنعت لکنت حرا

میں نے اپنی خواہشوں کی اطاعت کی اور انھوں نے مجھے اپنا غلام بنا ڈالا۔ اگر میں قناعت کرتا تو یقیناً آزاد رہتا۔

• اہل دانش کہا کرتے ہیں کہ طمع گلے کا طوق اور پاؤں کی بیڑی ہے۔ گلے کو طوق سے آزاد کرتے ہی پاؤں کی بیڑی بھی غائب ہو جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "لوگو، سن لو! طمع محتاجی ہے، اور ناامیدی تونگری ہے، جب تم میں سے کوئی شخص کسی چیز سے مایوس ہو جاتا ہے تو اس سے بے نیاز بھی ہو جاتا ہے" (مشکوٰۃ) اور یہ ایک امرِ واقعہ ہے، جس کی ناقابلِ انکار شہادت ہر انسان خود اپنے اندر پا سکتا ہے۔ انسان کی جبلت ہی یہ ہے کہ جس شے سے وہ ناامید ہو جاتا ہے اس کی طلب اور لالچ اپنے دل سے نکال دیتا ہے، پھر وہ نہ تو اس کی طرف نگاہِ احتیاج اٹھاتا ہے نہ اس کے سلسلہ میں کسی معین و مددگار کی تلاش میں ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے، اگر وہ کسی معاملہ میں پُر امید ہوتا ہے اور اس

کا دل اس سے اٹکا ہوا رہتا ہے، تو وہ اس کا بھی دیوانہ اور محتاج بنا رہتا ہے، اور ان لوگوں کا بھی، جن کے متعلق اس کو گمان ہوتا ہے کہ وہ اس چیز کے حاصل کرنے میں مفید ہو سکتے ہیں۔ غرض انسانی جبلت کا یہ ایک عام خاصہ ہے۔ مال وزر، جاہ و دبدبہ، حسن و جمال، جس شے کو بھی لو، ہر ایک کی تمنا میں یہی اصول کارفرما نظر آئے گا۔ خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ہے کہ:۔

فَابْتَغُوا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ	اللہ کے پاس اپنا رزق تلاش کرو، اس کی
وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ۔ (عنکبوت)	عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرتے رہو۔

رزق کے بغیر تو کوئی چارہ کار نہیں۔ ہر انسان کو اس کی ضرورت ہے۔ کہیں نہ کہیں سے اس کو حاصل ہی کرنا پڑے گا۔ اب اگر ایک شخص اپنا یہ رزق اللہ سے مانگتا ہے تو وہ اللہ کا بندہ ہوگا اور اسی کا بھکاری مانا جائے گا، اور اگر اللہ کو چھوڑ کر کسی مخلوق سے اسے طلب کرتا ہے تو عملاً اسی مخلوق کا بندہ ٹھہرے گا اور اسی کا دست نگر قرار پائے گا۔

سوال کرنے کی ممانعت یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نگاہ میں کسی مخلوق سے کچھ مانگنا اصولاً حرام اور ممنوع ہے اور محض ضرورت کے وقت ہی اس کی رخصت اور اجازت ہے۔ گدائی کی ممانعت میں بے شمار حدیثیں وارد ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) "جو لوگوں سے مانگتا رہے گا قیامت کے دن وہ اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ گوشت سے بالکل خالی ہوگا" (یعنی نہایت ذلت و رسوائی کے عالم میں)۔ (بخاری ومسلم)

(۲) "جس شخص نے غنی ہونے کے باوجود (یعنی اپنے لیے سامان زیست

رکھتے ہوئے بھی) سوال کا ہاتھ پھیلایا، قیامت کے دن یہ سوال اس کے چہرے میں زخم کے گہرے یا ہلکے اوچھے نشانات بن کر ظاہر ہوگا" (یعنے سائل کے حالات اور کیفیتِ سوال کے لحاظ سے زخم کے نشان زیادہ یا کم گہرے ہوں گے اور ساری مخلوق کے سامنے اُسے رسوا کریں گے) (ترمذی)

(۳) "تین آدمیوں کے سوا ہر شخص کے لیے سوال کرنا حرام ہے، ایک تو وہ مقروض جو قرض کے بوجھ کے نیچے بُری طرح پس رہا ہو، دوسرا وہ غریب جس کو فقر وفاقہ کی شدّت نے فرشِ خاک پر ڈال دیا ہو، تیسرا وہ خون کا مجرم خونِ بہا کی ادائگی جس کی کمر توڑ دے رہی ہو" (ابوداؤد)

(۴) "قسم خدا کی، اگر تم سے کوئی اپنی رسّی اٹھائے اور اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر اٹھا کر لائے اور بیچے اور اس طرح اللہ تعالیٰ اس کی عزت نفس کو گدائی سے محفوظ رکھے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرے، پھر جس کا جی چاہے دے جس کا جی چاہے نہ بھی دے" (بخاری)

(۵) "جو سوال کرنے سے بچتا ہے اللہ اس کو غنی کر دیتا ہے، جو عفت اختیار کرتا ہے اللہ اس کو عفیف بناتا ہے اور جو مصیبت پر صبر سے کام لیتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے صابر بنا دیتا ہے کسی شخص کو کوئی ایسی نعمت نہیں بخشی گئی جو صبر سے زیادہ بہتر اور بڑی ہو" (بخاری و مسلم)

(۶) "اس مال (خزانۂ بیت المال) میں سے اگر کچھ تمہیں دیا جائے اور اس سلسلہ میں تمہارا اپنا حال یہ ہو کہ نہ تو تم نے اس چیز کو زبان سے مانگا ہو نہ تمہارا دل اس کی خواہش رکھتا ہو تو اس مال کو لے لو، اور اگر یہ صورتِ حال نہ

ہو تو پھر اپنے آپ کو ایسے مال سے دور ہی رکھو۔

گویا فی نفسہ اس مال میں کوئی پہلو کراہت کا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق لینے
والے کی نفسیات سے ہے۔ اگر کسی کا دل اس کی حرص اور تمنائے حصول سے خالی
ہے تو پھر اس کے لے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ـــــ کیونکہ یہاں اس کی عبدیت
کا جوہر بالکل محفوظ رہتا ہے ـــــ اور اگر کوئی شخص زبان سے سوال کرتا ہے یا اس
کے دل کے کسی گوشہ میں بھی اس مال کی خواہش موجود ہے تو ایک مومن ہونے کی حیثیت سے
اسے ایسے مال کو ہاتھ لگانا روا نہیں، کیونکہ یہاں اس کے جوہر عبدیت کی پامالی کا اندیشہ ہے۔

خاص صحابہؓ کو سوال کی قطعی ممانعت

اوپر یہ تصریح گزر چکی ہے کہ اسلام کا مزاج
سوال کرنے کو کبھی گوارا نہیں کرتا، صرف
ضرورت کے وقت مخصوص مجبوریوں کے موقع پر اس کی رخصت دی گئی ہے۔ مگر شارع
علیہ السلام نے اپنے خاص صحابہ کو اس رخصت سے بھی منع فرما دیا تھا اور انھیں عزیمت
کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت فرماتے ہوئے حکم دیا تھا کہ کسی مخلوق سے کبھی کوئی سوال نہ کریں،
چنانچہ مسند میں یہاں تک مذکور ہے کہ "اگر حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جاتی تو
وہ کسی سے یہ نہ کہتے کہ ذرا اسے اٹھا دینا، اور فرماتے کہ میرے دوست نے مجھے حکم دیا ہے کہ انسانوں
سے کوئی سوال نہ کروں۔" صحیح مسلم میں حضرت عوفؓ بن مالک سے روایت ہے کہ نبی
صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کے ساتھ مجھ سے بیعت لی اور ہم سب کے کانوں میں آہستہ
سے یہ بات فرمائی کہ کسی سے کبھی کوئی سوال نہ کرنا جس کا اثر یہ تھا کہ ان میں سے اگر کسی کے
ہاتھ سے کوڑا بھی چھوٹ کر گر پڑتا تو وہ کسی سے یہ نہ کہتا کہ اسے اٹھا دو۔

خدا ہی سے سوال کرنے کا حکم

ایک دو نہیں بلکہ متعدد نصوص میں کتاب اور سنت

میں موجود ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ مانگنا ہو رزاقِ حقیقی ہی سے مانگو، کسی مخلوق کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤ :۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (الم نشرح) — پس جب تم خالی ہو تو کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب ہی سے التجا کرو۔

وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (نساء) — اور اللہ سے اس کا فضل (رزق) مانگتے رہو۔

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ (عنکبوت) — اللہ ہی کے یہاں اپنا رزق تلاش کرو۔

یہ آخری فقرہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ارشاد ہے، اس کے الفاظ کو دیکھو۔

"فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ" فرمایا، فابتغوا الرزق عند اللہ نہیں کہا، کیونکہ عِنْدَ اللّٰهِ کے الفاظ کو مقدم کر کے حصر اور اختصاص کا پہلو نمایاں کرنا مد نظر تھا، یعنی یوں فرمایا کہ رزق کسی غیر خدا سے مت مانگو، بلکہ صرف خدا ہی کے دربار سے مانگو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباسؓ کو نصیحت فرماتے ہیں :۔

• "اگر کچھ مانگنا ہو تو اللہ سے مانگو، اگر مدد چاہنا ہو تو اللہ سے چاہو"

ہر انسان طبعی طور پر دو چیزوں کا حاجت مند ہے :۔

ایک تو رزق وغیرہ ضروریاتِ زندگی کا، دوسری ضرر پہنچانے والی چیزوں سے اپنی حفاظت کا۔ ان دونوں امور میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ان کے لیے انسان جب پکارے تو اللہ ہی کو پکارے، ضرورت کے وقت بھی اُسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور مصیبت کے موقع پر بھی اسی سے فریاد کرے۔ جیسا کہ یعقوب علیہ السلام کا اسوہ ہمارے سامنے ہے بیٹے کے غم کی شدت جب برداشت نہ ہو سکی اور فرطِ اضطراب میں لبہائے مبارک بے اختیار متحرک ہونے لگے تو ان سے جو صدا نکلی وہ صرف یہ تھی کہ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ

وَحُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ (یوسف ۸۶) (میں اپنی پریشانی اور رنج و غم کا گلہ صرف اللہ سے کرتا ہوں)۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے "ہجر جمیل" کا ذکر اعلیٰ اخلاق کی حیثیت سے کیا ہے۔ علماء نے اس کی تشریح میں فرمایا ہے کہ "ہجر جمیل" کے معنی ہیں کسی کو کوئی تکلیف پہنچائے بغیر خاموشی کے ساتھ اس سے الگ ہوجانا، اور "صفح جمیل" کے معنی ہیں پیشانی پہ آثار عتاب لائے بغیر کسی کو معاف کردینا، اور صبر جمیل کے معنی ہیں زبان پر کسی مخلوق کے سامنے کوئی حرفِ شکایت لائے بغیر مصائب کو جھیل جانا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ کو حالتِ مرض میں یہ سنایا گیا کہ امام طاؤس رح مریض کے کراہنے کو مکروہ سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ شکوہ مخلوق ہے، تو امام موصوف نے کراہنا موقوف کردیا اور پھر اس کے بعد مرتے دم تک ان کے منہ سے آہ کا لفظ نہ سنا گیا۔

رہ گیا مصائب کے وقت حضرت باری تعالیٰ میں عرض شکایت کرنا تو یہ صبر جمیل کے منافی نہیں۔ جس کا ثبوت حضرت یعقوب علیہ السلام کے انہی مذکورہ بالا الفاظ میں موجود ہے کہ ایک طرف آپ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ فرماتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اِنَّمَا اَشْکُوْ بَثِّیْ وَ حُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ بھی کہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز فجر میں سورۂ یونس، یوسف اور نحل کی قرأت کرتے ہیں، اور جب اس آیت (اِنَّمَا اَشْکُوْ الخ) پر پہنچتے ہیں تو رو پڑتے ہیں اور رونے کی آواز آخری صفوں تک سنائی دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا فرماتے تھے:-

"خدایا احمد کا کلی استحقاق تجھی کو ہے، تو ہی ہماری شکایتوں کا مرجع ہے، تو ہی ہمارا سہارا ہے اور تو ہی ہمارا فریاد رس، تیرا ہی بھروسہ ہے اور جو قوت اور توانائی ہمیں ملتی ہے تیری ہی جناب سے ملتی ہے۔"

طائف کے اشقیاء نے جب رحمۃ للعلمین کے ساتھ بے رحمی کا مظاہرہ کیا تو زبان مبارک سے یہ کلمات ادا ہوتے سنے گئے :-

"اے اللہ! میں اپنی ناتوانی اپنی بے چارگی اور اپنی کس مپرسی کا تجھ سے گلہ کرتا ہوں، تو ہی ناتوانوں کا اور میرا رب ہے الخ"

ان واقعات اور تفصیلات کی روشنی میں یہ حقیقت کسی بحث وتمحیص کی محتاج نہیں رہ جاتی کہ اللہ کی بارگاہ میں اپنی شکایتوں کو پیش کرنا اور اپنی مصیبتوں کے متعلق عرض معروض کرنا ممنوع اور مذموم نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا کام ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جو شرعاً بڑا پسندیدہ کام ہے۔ جو بندہ اپنی حاجت براری کے لئے اللہ کے فضل وکرم کا جتنا ہی زیادہ حریص ہوگا اس کی عبدیت اتنی ہی زیادہ پختہ اور خالص ہوگی اور غیر اللہ سے اس کی بے نیازی اتنی ہی زیادہ مضبوط اور کامل قرار پائے گی۔ جس طرح کسی مخلوق سے حرص اور رغبت رکھنا اس کی غلامی کا موجب ہے، اور اس سے امیدیں نہ رکھنا اور بے رغبتی برتنا اس کی طرف سے قلب کی بے نیازی کا باعث ہے، اسی طرح خالق اور رازق حقیقی کی نعمتوں کی حرص اور رغبت رکھنا اس کی غلامی اور بندگی کی موجب ہے اور قلب انسانی کا اس کی طلب واحتیاج سے اعراض کرنا دراصل اس کی بندگی سے اعراض کرنے کے مرادف ہے

حُبِ غیر بندگی غیر

یہ خطرہ ان لوگوں کے بارے میں تو بہت زیادہ شدید ہے جو عملاً خالق کی طرف سے اپنی طلب اور امید کا رشتہ توڑ کر غیر مخلوق سے جوڑ لیتے ہیں اور اس طرح جوڑ لیتے ہیں کہ اسی کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا لیتے ہیں اور اسی پر اپنے اعتماد کی عمارت تعمیر کر لیتے ہیں، مثلاً ایک شخص اپنی ریاست، اپنی حکومت، اپنی فوج اور اپنے خدم وحشم پر ایک دوسرا شخص اپنے اہل وعیال اور احباب واقارب پر ایک تیسرا فرد اپنے مال ودولت

کے ذخیروں پر، چوتھا اپنے کسی آقا، کسی فرمانروا، کسی مخدوم، کسی پیر، کسی مرشد اور اسی طرح کے دوسرے بزرگوں پر، جو فنا ہو چکے ہیں یا جن کا فنا ہونا بہر حال یقینی ہے، اعتماد کر بیٹھا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نصیحت اپنے ہر بندہ کے لیے یہ ہے کہ :-

تَوَکَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ	بھروسہ رکھ اس ہستی پر جو زندہ جاوید ہے جس کو کبھی
بِحَمْدِهِ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ	فنا نہیں، اور اس کی حمد کیساتھ اس کی پاکی بیان کر۔
خَبِيرًا ۔ (فرقان)	وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے کے لیے ہر طرح کافی ہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جس شخص کا دل بھی کسی مخلوق کی طرف اس توقع کے ساتھ مائل ہوگا کہ وہ اس کے کسی آڑے وقت میں کام آئے گی، یا اُسے روزی مہیا کرے گی، یا اس کو راستی اور ہدایت عطا کرے گی، اُس کے دل میں اس کی عظمت ضرور پیدا ہوگی۔ وہ اس کے سامنے عاجزانہ جھکا ہوا گا، اور انجام کار اسی عقیدت اور اسی عاجزانہ جھکاؤ کے تناسب سے اس کے اندر اس کی غلامی اور بندگی بھی ضرور پیدا ہو جائے گی، اگرچہ دیکھنے میں وہاں کا امیر اور سردار اور آقا و فرمانروا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ حکیم کی نگاہ میں فیصلہ کن اہمیت ظواہر کی نہیں ہوتی، حقائق کی ہوتی ہے۔

اس عظیم حقیقت کو ایک واقعاتی مثال سے سمجھیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی عورت کے حسن وجمال سے متاثر ہو جاتا ہے تو، خواہ وہ عورت شرعاً اس کے لیے مباح ہی کیوں نہ ہو، اس کا دل اس کا اسیر محض بن کر رہ جاتا ہے، اور جس طرح چاہتی ہے اس کو اپنی انگلیوں پر نچاتی رہتی ہے۔ حالانکہ شوہر ہونے کی حیثیت سے ظاہر میں وہ اس کا آقا اور سردار ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ اس کا محکوم اور غلام ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت، جبکہ اس عورت کو بھی اس کے نیاز عشق اور فریفتگی شوق کا علم ہو جائے، اور اُسے یقین ہو کہ کسی حال میں

بھی، اس کی مفارقت اس کو گوارا نہیں ہو سکتی، اور خواہ کچھ ہی ہو جائے لیکن اس کو چھوڑ دینے اور کسی دوسری عورت سے رفاقتِ زندگی کا رشتہ جوڑ لینے کا تصور بھی اس کے لیے جانکاہ ہے۔ پھر تو وہ اس پر اسی طرح آمرانہ حکومت کرتی ہے جس طرح کوئی ظالم اور قاہر آقا اپنے زرخرید اور مجبورِ محض غلام پر کرتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سختی اور مطلق العنانی کے ساتھ۔ کیونکہ روح کی قید جسم کی قید سے، اور روح کی غلامی جسم کی غلامی سے کہیں زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ اگر ایک انسان کا جسم قید و بند غلامی میں ہو، لیکن اس کا دل آزاد اور قید کے اثرات سے محفوظ ہو تو اس کو اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ بلکہ بسا اوقات اس قید سے رہائی بھی مل جاتی ہے۔ لیکن جب سلطنتِ جسم کے بادشاہ — قلب — پر یہ آفت آجاتی ہے اور وہ کسی غیر اللہ کے دامِ قید یا حلقۂ غلامی میں جا پھنستا ہے تو پھر اس کی غلامی حقیقی غلامی ہوتی ہے، اور یہ غلامی دراصل تذلل اور عبودیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور قلب کی بندگی اور محکومی ہی وہ شے ہے جس پر ثواب اور عذاب ملا کرتا ہے چنانچہ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ اگر کسی مسلمان کو کوئی کافر ظلماً قید کر لے، یا کوئی فاسق اس کو زبردستی غلام بنا لے، تو یہ چیز اس کے دین و ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتی بشرطیکہ اس قید اور غلامی میں بھی وہ اپنے تئیں دین کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک مسلمان کسی کا فی الواقع غلام ہو اور وہ اللہ کے حقوق بھی ادا کرتا رہتا ہو اور اپنے دنیوی آقا کے حقوق بھی، تو اس کے لیے اللہ کے ہاں دہرا اجر ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کفار کے ہاتھوں میں پڑ کر کلمۂ کفر تک کہنے پر مجبور ہو جائے، تو یہ ظاہری اقرارِ کفر بھی، بشرطیکہ اس کے دل کے اندر ایمان بدستور موجود ہو، اس کی اسلامیت پر کوئی حرف نہیں لا سکتا۔ اس کے بخلاف اگر کسی کا جسم نہیں بلکہ اس کا دل کسی مخلوق کا غلام بن جاتا ہے تو یہ بات براہِ راست

یہ اس کے ایمان کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے، خواہ ظاہر میں وہ ایک سلطنت کا حکمراں ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ آزادی اور غلامی کا انحصار قلب پر ہے نہ کہ جسم پر، جس طرح کہ تونگری کا تعلق قلب سے ہے نہ کہ مال سے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "تونگری کا انحصار مال و دولت کی فراوانی پر نہیں ہے بلکہ دل پر ہے، اور اصل تونگری دل کی تونگری ہے"۔

یاد رہے کہ یہ حال تو اس عشق کی نیازمندیوں کا ہے جو شرعی طور پر کسی مباح صورت سے تعلق رکھتا ہو۔ رہی یہ شکل کہ کسی کا دل کسی غیر عورت یا کسی حسین لڑکے کی محبت میں غرق ہو گیا ہو اور وہ اس کے عشق کے آستانہ پر اپنی متاعِ قلب نثار کر چکا ہو، تو پھر یہ وہ عذاب مجسم ہے جس کے ساتھ کسی خیر اور ثواب کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا شخص تو ان بدبختوں میں شمار ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے سب سے زیادہ دور، اور اس کے عذاب سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ کیونکہ کسی حسین صورت کا عاشق جب تک اس صورت کے تصور میں ڈوبا ہوا اور اس کا پرستار بنا رہتا ہے اس وقت تک وہ اور اس کے دل و دماغ نہ جانے کتنی بے شمار برائیوں اور برے خیالات کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ اور اگر بالفرض وہ اس سلسلہ میں فاحشۂ کبریٰ کے ارتکاب سے بچا بھی رہ گیا تو بھی صورتِ محبوب کے تصور میں اس کے قلب کا مجرد دائمی انہماک ہی اس کے حق میں کافی ضرر رساں ہے، اس سے تو ہلکی بات یہی ہے کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا گناہ کر ڈالتا اور پھر اس سے اس طرح تائب ہو جاتا کہ اس کا دل اسی گناہ کی طرف میلان سے بالکل پاک ہو رہتا۔ ایسے بوالہوسوں اور صورت پرستوں کا حال تو مستوں اور مجنونوں کا سا ہوتا ہے، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر، کیوں کہ مجنون کو تو کبھی ہوش بھی آجاتا ہے، مگر انہیں اپنے خمار عشق سے ایک لمحہ کی رہائی

نصیب نہیں ہوتی۔

اس آفتِ روحانی کے سلسلے کی سب سے بڑی اور آخری بدبختی یہ ہے کہ قلب اللہ کے ذکر اور فکر سے یکسر خالی ہو جاتا ہے اور حلاوتِ ایمانی کے احساس سے بالکل محروم۔ اگر انسان کا دل اخلاصِ ایمانی اور عبادتِ الٰہی کا لذت آشنا ہو تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شے بھی اس سے زیادہ شیریں اور مرغوب نہیں رہ جاتی کہ اس کی طرف والہانہ رغبت کے ساتھ متوجہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی محبوب چیز کو اسی وقت چھوڑتا ہے جب اس کی نگاہ میں کوئی دوسری چیز اس سے بھی زیادہ محبوب بن جائے، یا یہ کہ اس کے تعلق سے اسے کسی بڑے نقصان اور مصیبت کا اس کو خوف لاحق ہو جائے پس کسی غلط اور فاسد محبت سے قلب انسانی کو یا تو عشقِ صالح آزاد کرا سکتا ہے یا کوئی بڑا اندیشۂ زیاں۔ اللہ تعالیٰ یوسف علیہ السلام کے راز عفت کے متعلق فرماتا ہے:۔

كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ (یوسف)	ایسا ہوا تاکہ ہم یوسف کو برائی اور بے حیائی سے بچالیں، یقیناً وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ قلبِ مومن کو "سوء" میں مبتلا ہونے سے ——— یعنی انسانی حسن کی طرف کسی غیر مناسب طریقہ پر مائل ہونے اور اس کے دام میں گرفتار ہونے سے ——— بچاتا ہے اور اس کے اخلاصِ ایمانی کے صدقہ میں "فحشاء" سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک انسان بندگی کے حقیقی ذوق اور اخلاص کی یعنی لذت سے شاد کام نہیں ہوتا اس کا نفس اسے اپنی خواہشات کی چاکری میں لگائے رہتا ہے، اور وہ اس کے سامنے بے بس بنا رہتا ہے۔ مگر جب وہ ایک بار

اخلاص کا لذت شناس ہو لیتا ہے اور اس کی قوتیں دل میں راسخ ہو جاتی ہیں تو بغیر کسی کشاکش کے نفس کی خواہشیں اس کے آگے ماتھا ٹیک دیتی ہیں۔ قرآن کے بیان کردہ فلسفۂ نماز میں ہمیں یہی حقیقت ملتی ہے، فرمایا گیا ہے :-

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۔ (عنکبوت)	بلا شبہ نماز بے حیائی کے کاموں اور برائیوں سے روکتی ہے، اور اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے

یعنی نماز کی افادیت کے دو پہلو ہیں :- ایک تو فطری مکروہات (فحشاء اور منکر) کا استیصال، دوسرے ایک فطری محبوب شے (یاد الٰہی) کا حصول۔ باعتبار مقصد دوسرا پہلو پہلے سے اہم اور افضل ہے، کیونکہ اللہ کی یاد اور اس کی عبادت ہی مقصود بالذات ہے اور برائی اور ناپسندیدہ صفات سے نفسِ انسانی کا محفوظ رہنا اس راہ کا صرف ایک ناگزیر مرحلہ، یا یوں کہئے کہ اس مقصد کے حصول کا ایک زینہ ہے۔ اس لئے قدرتاً اس کی حیثیت ثانوی ہوگی۔ انسان کا دل ایک ایسی چیز ہے جو پیدائشی طور پر حق پسند اور حق طلب واقع ہوتی ہے۔ اس لئے جب برائی کا تصور اس کے سامنے آتا ہے تو وہ اُسے دور دھکیلنے کی سعی کرتا ہے، کیونکہ برائیاں اور برے خیالات اس کو اس طرح تباہ کر دیتے ہیں جس طرح خودرو گھاس پات زراعت کو۔ یہی حقیقت ہے جو ذیل کی آیات میں ہمیں ذہن نشین کرائی گئی ہے :-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ﴿﴾	بامراد ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک کیا
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (والشمس)	اور نامراد رہا وہ جس نے اس کو آلودہ کیا۔
قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿﴾ (اعلیٰ)	اس نے فلاح پائی جو پاک ہوا اور جس نے اپنے پروردگار کو یاد کیا، نماز پڑھی۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ (نور)

مومنوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ طریق کار ان کے لئے سب سے زیادہ پاکیزہ ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا (نور)

اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک، نہ ہو سکتا۔

غور کیجیے، کس طرح اللہ تعالیٰ نے "غضِ بصر" اور "حفظِ فروج" کو نفس کے "تزکی" یعنے پاکیزہ تر قرار دیا ہے اور واضح فرما دیا ہے کہ خواہش پرستی سے دور رہنا پاکیزگی نفس کا ایک بنیادی جزو ہے "پاکیزگیٔ نفس" ایک جامع لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نفس تمام برائیوں سے ——— مثلاً فواحش، مظالم، جھوٹ اور شرک وغیرہ سے پاک صاف ہو جائے۔

• حسن پرست ہی جیسا حال اس شخص کا بھی ہے جو کسی حکومت کا طالب ہوتا ہے اور زمین پر اپنی فرمانروائی اور سرداری اور کبریائی کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ اندر سے دیکھو تو وہ بھی اپنے حمایتیوں اور مددگاروں کا غلام نظر آئے گا، اگرچہ ظاہر میں وہ ان کا سردار اور حکمراں ہی دکھائی دیتا ہو گا۔ کیونکہ اس نے اپنے اوپر آقائی اور حکمرانی کی نقاب ضرور ڈال رکھی ہو گی، لیکن اس نقاب کے پیچھے جو دل ہو گا وہ فی الواقع الٹے انہی حمایتیوں اور محکوموں کے "خوف ورجا" سے لبریز ہو گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھولے رکھتا ہے، انھیں بڑی بڑی جاگیریں بخشتا رہتا ہے اور ان کی کتنی ہی لغزشیں دیکھتا ہے مگر چشم پوشی کر جاتا ہے۔ آخر وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ صرف اس لیے تاکہ وہ اس کی

اطاعت اور اعانت کے لیے برابر تیار رہیں، اور اس کے حسب منشا جد و جہد کرنے سے کبھی کترا نہ جائیں۔ ورنہ حکومت کرنے کی امنگ بس حسرت بن کر رہ جائے گی۔ بنابریں ظاہر میں وہ ان کا آقا اور مطاع ضرور ہے، پر حقیقت میں وہ خود ہی ان کا مطیع اور غلام ہے۔

لیکن اگر ذرا اور گہری نظر سے دیکھو تو محسوس ہوگا کہ فی الواقع یہ دونوں ہی ایک دوسرے کے غلام ہیں اور ہر ایک کے اندر دوسرے کی "عبودیت" موجود ہے، کیونکہ ہر ایک دوسرے کا اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے۔ اس لیے یہ سب کے سب عبادتِ الٰہی کی حقیقت سے بے بہرہ ہیں۔ اور اگر ان دونوں کا مذکورہ بالا تعاون خدا کی زمین پر ظالمانہ علو اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہو تو ان کی حیثیت ان دو بد باطنوں سے کچھ مختلف نہیں رہ جاتی جو کسی بد معاشی یا رہزنی میں ایک دوسرے کی امداد کریں۔ غرض نفس کی خواہشیں اور اپنی اغراض ہی وہ چیزیں ہیں جنھوں نے اس فرمانروا کو اپنے نام کے فرماں برداروں کا، اور ان فرمانبرداروں کو اس نام نہاد فرمانروا کا، عبد اور غلام بنا رکھا ہے۔

مال و دولت کا حریص بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے۔ اگر عاشقِ صورت حسنِ صورت کا، اور طالبِ حکومت اپنے سپاہیوں اور سپہ سالاروں کا پرستار ہوتا ہے تو یہ بھی اپنی زندگی مال و زر کی بندگی اور پرستش کی نذر کیے ہوتا ہے۔

ترکِ دنیا مراد نہیں

اس تنقیح سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام ترکِ دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مادی امور دنیوی چیزیں دو طرح کی ہوتی ہیں:۔ کچھ چیزیں تو ایسی ہیں جن کا، انسان فطری طور پر ضرورت مند ہے۔ مثلاً کھانا، پانی، لباس، مکان، بیوی وغیرہ۔ اس لئے ان چیزوں کو ایک

بندۂ مومن بھی لازماً حاصل کرتا ہے۔ لیکن ان کے حاصل کرنے میں اس کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ انھیں اللہ ہی سے مانگتا ہے، اور ان کے سلسلے میں اُسی کے حضور رجوع کرتا ہے۔ نیز وہ مال واسباب جن سے وہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے میں کام لیتا ہے، ان کی حیثیت اس کے نزدیک اس گھوڑے یا گدھے سے جس پر وہ سوار ہوا کرتا ہے، یا اس فرش سے جس پر وہ بیٹھا کرتا ہے، بلکہ اس قدمچے سے بھی جس پر وہ بیٹھ کر رفع حاجت کرتا ہے، زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ اسبابِ زندگی اس کو ایسا گرویدہ نہیں بنا لیتے کہ وہ بس انھیں کا ہو رہے اور اس پر إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا، کی کیفیت طاری ہو جائے۔

دوسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کی ضرورت، انسانی زندگی کے لیے حقیقی اور فطری نہیں۔ اس لیے ایسی چیزوں کی فکر اور تمنا میں مبتلا ہونا ایک بندۂ خدا کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اور اگر ان چیزوں سے کوئی دلی وابستگی پیدا کرتا ہے تو یقیناً وہ اس کو اپنا غلام بنا لیتی ہیں، اور بسا اوقات تو اپنی غلامی میں اسے اس حد تک جکڑ لیتی ہیں کہ وہ ان کے لیے غیر اللہ پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔ جس کے بعد اس کے دل کے اندر اللہ کی سچی بندگی اور توکل کا وجود بہر حال باقی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ صاف صاف یوں کہنا چاہیے کہ اس کے اندر غیر اللہ کی بندگی اور غیر اللہ پر توکل، اگر مکمل طور پر نہیں تو جزوی طور پر ہی، ضرور موجود پایا جائے گا۔ ایسا آدمی ارشادِ نبوی تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ الخ کا اولین مصداق ہے کوئی شک نہیں کہ وہ ان درہموں اور دیناروں ہی کا بندہ ہو رہتا ہے، خواہ وہ انھیں اللہ ہی سے کیوں نہ مانگے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے باوجود وہ اس کے فیصلوں پر صابر اور شاکر نہیں رہتا بلکہ اگر اللہ تعالیٰ اس کی سعی کر دیتا ہے تب تو خوش رہتا ہے ورنہ ناخوش۔ کیا اللہ کی بندگی کے یہی

معنی ہیں ؟ اللہ کا بندہ تو وہ ہوتا ہے جو ہر اس بات سے خوش ہوتا ہے جس سے اللہ خوش ہو، اور ہر اس بات سے بیزار ہوتا ہے جس سے اللہ بیزار ہو، اس چیز کو پسند کرتا ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہوں اور اس چیز سے نفرت کرتا ہے جس سے اللہ اور رسول نفرت کرتے ہوں، اللہ کے دوستوں کو دوست رکھتا ہے اور اس کے دشمنوں کو دشمن۔ ایمانِ کامل کی دولت سے بہرہ ور بس ایسا ہی شخص ہوتا ہے، جیسا کہ ایمان کے معلم اور ہادیِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں پر وضاحت سے فرمایا ہے :-

(۱) "جس نے اللہ ہی کے لیے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے دشمنی، اللہ ہی کے لیے خرچ کیا اور اللہ ہی کے لیے (خرچ کرنے) سے رک رہا، اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔

(۲) ایمان کا سب سے مضبوط رشتہ یہ ہے کہ انسان اللہ ہی کے لیے محبت کرے اور اللہ کے لیے دشمنی"

(۳) "تین چیزیں جس کے اندر ہوں گی وہی ایمان کی حلاوت اور لذت پائے گا (۱) اللہ اور اُس کا رسول ساری کائنات سے زیادہ اس کو محبوب ہوں (۲) جس سے بھی محبت رکھے صرف اللہ ہی کے لیے رکھے (۳) کفر سے نکل آنے کے بعد اُس کی طرف لوٹ جانے کو اتنا ہی ناپسند کرے جتنا کہ آگ میں گر پڑنے کو ناپسند کرتا ہے"

جب کوئی شخص ایمان کی اس منزل پر پہنچ لے گا اُسی وقت وہ اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور عدم رضا کے ماتحت کر سکے گا، اور اُسی وقت دنیا جہاں کی ہر شے

سے بڑھ کر اللہ اور رسول اس کی نگاہوں میں عزیز ہوں گے، اور مخلوق کی محبت اگر وہ کرے گا تو محض خدا کے لیے کرے گا، نہ کہ کسی دوسری غرض سے اس طرح اس کی یہ محبت خلق بھی محبتِ خدا ہی کا مقتضا، بلکہ اس کا ایک تکمیلی پہلو ہوگی۔ کیونکہ عشق کا اصول ہی یہ ہے کہ "ندیم دوست"، سے بھی "بوئے دوست" آتی ہے۔ اور محبوب کے کسی محبوب کی محبت بھی کمالِ محبت کی نشانی ہوتی ہے۔

حُبِ رسولؐ کی حقیقت یہیں سے اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور اولیاء سے محبت رکھنے کی بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایک شخص جو اِن برگزیدہ بندوں کی محبت اس لیے اور محض اسی لیے کرتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے پسندیدہ طریقوں کے بتانے والے ہیں، تو فی الواقع اس نے ان کی محبت خدا ہی کے لیے کی، نہ کہ ان کی ذاتی حیثیت سے قرآن مجید کہتا ہے:۔

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ ۔ (مائدہ)

تو عنقریب اللہ تعالیٰ کچھ دوسرے لوگوں کو لائے گا جن سے اُس کو محبت ہوگی اور جن کو اس سے محبت ہوگی، مومنوں کے حق میں وہ بالکل نرم ہوں گے اور کافروں کے حق میں نہایت سخت۔

معلوم ہوا کہ مومنوں اور خدا پرستوں سے نرمی، اخوت اور محبت کے ساتھ پیش آنا محبتِ خداوندی ہی کا لازمہ اور اسی کا ایک فطری تقاضا ہے۔ یہی امر واقعی تو ہے جس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آلِ عمران)

اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میرا اتباع کرو، اللہ تم کو اپنا محبوب بنائے گا۔

اور یہ اس لیے کہ نبی ان کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور خود بھی انہی کاموں کو کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، اور ان کاموں سے روکتا ہے اور خود بھی رکتا ہے جو اللہ کو ناپسند ہیں، نیز ایسی حقیقتوں سے آگاہ کرتا ہے جن سے انسان کا آگاہ ہونا اور جن کو ماننا اللہ کو محبوب و مطلوب ہے۔ اس لیے جو خدا سے محبت رکھنے کا دعویٰ رکھتا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ رسولِ خدا کا اتباع کرے، اس نے غیب و شہود کی جن حقیقتوں کی خبر دی ہو ان کو دل سے برحق مانے، اس کے ایک ایک حکم کے سامنے بخوشی سرِ اطاعت خم کر دے، اور میدانِ عمل میں اپنا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے رسول کا نقشِ قدم دیکھ لے۔ جس نے ایسا کیا وہ محبتِ الٰہی کے دعوے میں سچا اور امتحان میں کامیاب رہا، اور انجام کار خدا کی محبوبیت کے شرف سے سرفراز رہے گا۔

محبتِ الٰہی کی حقیقی علامتیں

اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کو اپنی محبت کی پہچان قرار دیا ہے:۔ اتباعِ رسول اور جہاد فی سبیل اللہ۔

"جہاد فی سبیل اللہ" کے معنی ہیں خدا کی محبوب چیزوں —— ایمان اور اعمالِ صالحہ —— کے حاصل کرنے میں، اور خدا کی ناپسندیدہ چیزوں —— کفر و فسق اور تمرد و عصیان —— کے مٹا ڈالنے میں اپنی ساری قوتیں اور کوششیں صرف کر ڈالنا۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ	اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ
وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ	تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں
اَمْوَالُ اِۨقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ	تمہارے خاندان، تمہارے وہ مال جنہیں تم نے
كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ	کما رکھا ہو، تمہاری وہ تجارت جس کے سرد پڑ جانے
اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ	کا تمہیں کھٹکا لگا رہتا ہے، اور تمہارے دل پسند

سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔ (توبہ)

مکان تمہاری نگاہوں میں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو ٹھیرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔

غور کیجئے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو، جو اس کے اور اس کے رسول کے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلہ میں اپنے اہل اور اپنے مال کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں، کتنی خوفناک وعید سنا رہا ہے

اسی طرح "حب رسول" کے سلسلے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم واضح لفظوں میں فرماتے ہیں:۔

"قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم سے کوئی شخص (پکا) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی نظروں میں اُس کے بیٹے اور اُس کے باپ اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے عرض کیا:۔

"یارسول اللہ! آپ مجھے اپنی جان کے سوا باقی ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں"

ارشاد ہوا کہ:۔

نہیں اے عمر! (تم پکے مومن نہیں ہو سکتے) تاوقتیکہ میں تمہیں تمہاری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"

یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ پکار اٹھے:۔ "خدا گواہ ہے کہ اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔"

فرمایا "ہاں! اب اے عمر!"

معلوم ہوا کہ کمالِ محبت پیدا کرنے کے لیے محبوب سے کامل موالات کا جذبۂ صادق پیدا کرنا ضروری ہے۔ "کامل موالات" کا مطلب یا اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی پسند اور ناپسند کو اور اپنی محبت اور عداوت کو محبوب کی پسند و ناپسند کے اور اس کی محبت و عداوت کے تحت کر دیا جائے۔ یہ معلوم ہی ہے کہ محبوب حقیقی ___ اللہ تعالیٰ ___ کی پسندیدہ چیزیں "ایمان" اور "تقویٰ" ہیں، اور اس کی ناپسندیدہ چیزیں فسق اور عصیان ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ محبت میں قلب انسانی کو متحرک کر دینے کی بڑی زبردست قوت ہوتی ہے۔ جب کبھی وہ انسان کے دل میں جڑیں پکڑتی ہے تو اس کو اپنی مطلوب چیزوں کے حاصل کرنے پر برابر ابھارتی رہتی ہے۔ اگر محبت، حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہو تو مطلوب چیزوں کے حاصل کر لینے کا ارادہ بھی پختگی کی آخری حد پر ہوگا۔ اب اگر بندہ ظاہری اسباب و ذرائع کا بھی مالک ہے تو ان چیزوں کو حاصل کیے بغیر وہ دم ہی نہ لے گا، لیکن اگر ظاہری اسباب و ذرائع کی عدم موجودگی کی وجہ سے معذوریاں اس کی راہ روک لیتی ہیں اور اپنی انتہائی کاوش کے باوجود انھیں وہ حاصل نہیں کر پاتا تب بھی اُس کو ناکام نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اس صورت میں بھی اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کے لیے اتنا اجر ہے جتنا ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی اس کوشش میں عملاً کامیاب ہو جاتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:-

"جس شخص نے ہدایت کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا کہ اس ہدایت کے ماننے والوں کو ملے گا، اور یہ ان (ہدایت قبول کر لینے والوں) کے اجر میں بغیر کسی کمی کے ہوگا، اسی طرح جس نے لوگوں کو گمراہی کی طرف بلایا، اس کو بھی اتنا ہی عذاب ہوگا جتنا کہ اس گمراہی کے قبول کر لینے والوں کو ہوگا، اور ایسا ان کے عذابوں میں بغیر کسی تخفیف کے ہوگا۔"

ایک جہاد کے موقع پر پوری خواہش رکھنے کے باوجود کچھ لوگ۔ اس میں کسی نہ کسی مجبوری کی بنا پر شریک نہ ہو سکے تھے، ان کے متعلق آپؐ نے فرمایا :۔

" مدینہ میں رُکے ہوئے کچھ ایسے لوگ ہیں جو ہر میدان اور ہر وادی میں، جس کو تم نے اپنی مجاہدانہ تگ ودو میں طے کیا ہے، تمہارے ہم رکاب رہے ہیں "۔

صحابہ نے پوچھا :۔ کیا مدینہ میں رہتے ہوئے بھی (وہ ہمارے ساتھ رہے ہیں)

جواب دیا :۔ ہاں مدینہ میں رہتے ہوئے بھی۔ کیونکہ وہ از خود، وہاں نہیں رہ گئے ہیں بلکہ عذر نے انھیں روک رکھا ہے "۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے 'جہاد' نام ہے اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں کے حاصل اور برپا کرنے، اور اس کی مبغوض اور ناپسندیدہ چیزوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں اپنی تمام طاقتیں اور کوششیں صرف کر ڈالنے کا۔ پس جہاد ہی دراصل وہ کسوٹی ہے جس ہر بندۂ الٰہی کا دعوائے حبِ الٰہی کس کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص طاقت اور قدرت رکھنے کے باوجود، اپنی طاقت کے مطابق، فریضۂ جہاد بجا نہیں لاتا تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ خدا اور رسول کے ساتھ اس کی محبت اپنے اندر کوئی خاص روح نہیں رکھتی۔ اس فرض کی ادائیگی میں وہ اپنی استطاعت کے لحاظ سے جتنی سستی اور بے توجہی دکھائے گا اتنا ہی اپنی محبت کے کھوکھلے پن کا زبانِ حال سے اقرار کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس فرض کی بجا آوری کا راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن محبت کی اس سنت کو کون نہیں جانتا کہ محبوب تک رسائی اور باریابی عموماً خطرات اور مصائب اٹھانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ محبتِ صالحہ کی بھی یہی سنت ہے اور یہی محبتِ فاسدہ کی بھی۔ حکومت کا شیدائی تختِ حکومت کو، دولت کا پرستار خزانۂ دولت کو، حسن صورت کا دیوانہ وصال

محبوب کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک آخرت میں پیش آجانے والے عذاب شدید کے علاوہ اس دنیا میں بھی ہولناک مشکلات سے دوچار نہ ہولے ۔ اس لیے اگر اللہ اور رسول کا محب ان کی محبت کی راہ میں اتنی جانبازی بھی نہ دکھائے جتنی غیر اللہ سے محبت رکھنے والوں میں سے ایک صاحبِ عقل و عزیمت اپنے محبوب کی خاطر دکھاتا ہے ۔ تو یقیناً وہ اپنی محبت کی کمزوری اور سطحیت کی ایک ناقابلِ تردید دلیل فراہم کرتا ہے ۔ حالانکہ مومن کی صفت یہ ہے کہ ساری کائنات سے زیادہ اس کو اللہ سے محبت ہوتی ہے قرآن کہتا ہے :۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ۔ اور جو اہل ایمان ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں ۔ (البقرہ)

ہاں ، ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ محبت میں صرف جوش اور خلوص ہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ضمانت نہیں ہو سکتا ، بلکہ اس کے ساتھ عقل اور ہوش کی بھی ضرورت ہے ۔ ورنہ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ محب صادق سچی محبت رکھنے کے باوجود ، اپنی عقل کی کمی ، نظر کی کوتاہی اور تصور کی نارسائی کے باعث ایسی راہ اختیار کر لیتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی منزل پر پہنچ نہیں پاتا ۔ ایسی غلط راہ تو اس وقت بھی مذموم ہوتی ہے جب کہ محبت صالح ہو ۔ اگر محبتِ فاسدہ میں کوئی اس طرح کی راہ اختیار کر لے تو پھر اس کی محرومی کا کیا پوچھنا ۔ جیسا کہ حکومت ، دولت اور صورت کے بعض اندھے دیوانے کیا کرتے ہیں ۔ ایک تو ان کی محبت کا رُخ ہی غلط ہوتا ہے ، دوسرے اپنے مطلوب کے حصول میں عقل و خرد کی تمام ہدایتوں سے آزاد ہو جاتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کچھ نہیں لگتا ، البتہ طرح طرح کی مصیبتیں اور خواریاں انھیں اپنی آماجگاہ ضرور بنا لیتی ہیں ۔ لہٰذا راہِ محبت میں سر رشتۂ عقل کا دامن ہاتھ میں رہنا ضروری ہے ۔ ورنہ کامیابی سراب ثابت ہوگی ۔

اس توضیح کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ قلب انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اتنی ہی اس کی عبودیت بھی بڑھتی جائے گی، اور وہ ماسوا سے اسی قدر آزاد اور بے نیاز ہوتا چلا جائے گا۔ اسی طرح اس میں عبدیت کا رنگ جتنا گہرا ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی اللہ کے عشق اور غیر اللہ کے بے نیازی کا نقش اس کے اندر پائیدار ہوتا چلا جائے گا۔

انسان فطرۃً اللہ کا محتاج ہے

انسان کی فطرۃ میں اللہ تعالیٰ کی احتیاج موجود ہے، ایسی احتیاج جس میں عجز اور تذلل کا عنصر بھی شامل ہے اس احتیاج کی دو جہتیں ہیں: ۔ ایک توجہت عبادت، جس کو علت غائی کہنا چاہیے، دوسری جہت استعانت و توکل جس کو علت فاعلی کہنا چاہیے پس قلب انسانی اللہ کی عبادت، محبت اس کی طرف انابت کے بغیر نہ تو کبھی حقیقی صلاح و فلاح حاصل کر سکتا ہے، نہ سچی لذت اور سرور کی دولت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ اور نہ سکون خالص اور اطمینان صادق کی نعمت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس کو دنیا بھر کی نعمتیں اور لذتیں میسر کیوں نہ آجائیں، لیکن پھر بھی اضطراب کی خلش اس کی گہرائیوں میں موجود ہی رہے گی، اور حقیقی سکون و اطمینان کی لذت سے وہ محروم ہی رہے گا کیونکہ محبوب حقیقی کی فطری پیاس سے وہ کبھی بالکلیہ آزاد نہیں ہو جا سکتا، اور نہ ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر سے اپنے پروردگار کی ذاتی احتیاج اور فطری طلب بالکل ہی نکل جائے اس لیے کہ فی الواقع وہی اس کا اعلیٰ معبود اور محبوب ہے، اور اسی کو پاکر وہ صحیح معنوں میں سکون و طمانیت اور لذت و سرور سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ پھر یہ محبوب و مطلوب حقیقی اس کو حاصل نہیں ہو سکتا جب تک خود وہی (اللہ تعالیٰ ہی) اس کی اس معاملہ میں دستگیری نہ کرے ورنہ اس کے سوا اس پوری کائنات میں کوئی جو اس کے کام آسکے۔ ان دونوں حقیقتوں کے پیش نظر انسان کا قلب دائمی طور پر اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی روح اور اس کی حقیقت کی کا بھی فطرۃً محتاج ہے اور

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کی روح و حقیقت کا بھی۔ اس لیے اگر اس کے محبوب اور مقصودِ حقیقی کے حصول میں اس کی اعانت کر بھی دی جائے۔ لیکن عبادتِ الٰہی کا ایسا سچا ذوق اس میں موجود نہ ہو کہ وہی اس کی طلب و جستجو کا مرکز قرار پا چکا ہو، اوّل و آخر اسی کی محبت اس کا سرمایۂ زندگی بن چکی ہو اور اس کے علاوہ جس کسی سے بھی وہ محبت کرتا ہو، اصلاً نہ کرتا ہو بلکہ خدا ہی کے لیے کرتا ہو ——— تو اس امر کے باوجود وہ نہ تو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا رمز شناس ہو سکتا ہے نہ توحید، عبدیت اور محبتِ الٰہی کے درجۂ کمال تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں نہ صرف یہ کہ اس کی مومنانہ حیثیت میں ایک نقص اور عیب موجود ہوگا، بلکہ ہر وقت وہ ایک قسم کی بے چینی اور حسرت اور اندرونی خلش بھی محسوس کرتا رہے گا۔

اسی طرح اگر وہ خدا کو اپنا مطلوبِ حقیقی تو سمجھتا ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لیے ریاضتیں بھی کرتا ہو، مگر اس سعی و جستجو میں نہ تو خدا ہی سے توفیق طلبی کرتا ہو، نہ اس مقصد کے حصول میں اُس کی اعانتوں کا خود کو حاجت مند قرار دیتا ہو، اور نہ اس سلسلہ میں تنہا وہی اس کی امیدوں کا ملجا و ماویٰ ہو، تو کبھی بھی گوہرِ مقصود سے اس کا دامن بھر نہیں سکتا۔ کیونکہ کسی چیز کا وجود اور عدم خدا ہی کی مشیت کے تابع ہے۔

غرض انسان دو حیثیتوں سے اللہ جل شانہٗ کا محتاج ہے:۔ ایک تو یہ کہ وہی اس کا تنہا اور حقیقی مطلوب، محبوب اور معبود ہے، دوسری یہ کہ تنہا وہی اس کا چارہ ساز، پشت پناہ، دستگیر، مرکزِ امید اور مرجعِ اعتماد ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہی اس کا "الٰہ" ہے جس کے سوا کوئی اس کا معبود نہیں، اور پھر وہی اس کا "رب" ہے جس کے سوا کوئی اس کا مالک و آقا نہیں۔ اس لیے عبودیت انسان کی کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ دونوں

چیزیں اس کے اندر موجود نہ ہوں۔ ورنہ اگر کوئی شخص کسی غیر اللہ کی محبت بالذات کرتا ہے، یا اس سے اعانت کی امیدیں وابستہ رکھتا ہے تو دراصل وہ اپنی اس محبت اور امید کی مقدار کے مطابق اسی غیر اللہ کا بندہ ہے۔ بخلاف اس کے اگر غیر اللہ سے اس کی محبت بالذات نہ ہو بلکہ خدا ہی کے لیے ہو، نیز خدا کے سوا کبھی کسی سے کوئی امید نہ باندھتا ہو، اور جن اسباب و ذرائع سے اپنے مقاصد کے حصول میں کام لیتا یا انھیں حاصل کرتا ہو، ان کے متعلق پورے شرح صدر کیساتھ یہ یقین رکھتا ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے ان اسباب کو پیدا، اور ان سے میرا کام لینا مقدر کیا ہے، بجائے خود یہ کوئی قدرت اور تاثیر نہیں رکھتے، نہ کسی اور کے اشارے پر یہ وجود میں آئے ہیں، بلکہ اس زمین کی سطح سے لیکر آسمان کی بلندیوں تک جتنی چیزیں موجود پائی جاتی ہیں ان سب کا پروردگار، سب کا آقا، اور سب کا خالق اللہ ہی ہے، اور سب کی سب ہر حیثیت سے بس اسی کی محتاج ہیں ــــ اگر انسان ان صفات اور تصورات سے آراستہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی قسمت کے مطابق کمال عبودیت سے سرفراز ہے۔ اس سعادت کے حصول میں لوگوں کے درجے اس مختلف ہیں کہ ان کا صحیح اندازہ صرف اللہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ تمام لوگوں میں فضل و کمال، عظمت و بزرگی اور ہدایت و تقرب الٰہی کے لحاظ سے وہی شخص سب سے اونچا ہے جس کی عبدیت مذکورہ بالا تمام وجوہ سے سب سے اونچی ہو۔

یہی ہے اس دین کی حقیقت جسے اسلام کہا جاتا ہے، اور جس کی تعلیم و تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتابیں نازل کیں۔ یعنی یہ کہ بندہ اپنے آپ کو ہر حیثیت سے خدا ہی کا تابع فرمان بنائے رکھے، اور ذرہ برابر بھی کسی غیر کا فرمانبردار نہ رہے۔ ایسا شخص جو خدا کو بھی اطاعت کا مستحق سمجھتا ہے اور ساتھ ہی کسی دوسرے کو بھی،

وہ مشرک ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس جو خدا کی اطاعت و انقیاد کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا وہ کبر کی لعنت میں گرفتار ہے۔

کبر اور عبدیت میں منافات

کبر کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

" یقین رکھو، جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا، بالکل اسی طرح جس طرح کہ دوزخ میں وہ شخص نہیں جا سکتا جس کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا" (صحیح بخاری)

گویا معلم ایمان صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک غرور اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں، کیونکہ غرور عبودیت کی حقیقت کے بالکل منافی ہے، جیسا کہ ذیل کی حدیث قدسی کے الفاظ بتلاتے ہیں:- " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عظمت میری " ازار " ہے اور کبریائی میری " ردا " ہے۔ جو شخص ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اس کو سخت سزا دوں گا " (صحیح بخاری)

معلوم ہوا کہ عظمت اور کبریائی اللہ رب العزت کی مخصوص صفات میں سے ہیں۔ کسی مخلوق کو ان صفاتِ جلالی میں سے کوئی حصہ بھی نہیں ملا ہے۔ لیکن ان دونوں میں بھی " کبریائی " کا مقام " عظمت " سے اونچا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بمنزلۂ " ردا " قرار دیا ہے اور عظمت کو بمنزلۂ " ازار " کہا ہے۔ ردا (چادر) ازار (تہ بند) سے بلند مقام پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اذان، نماز اور عیدین کا شعار " اللّٰہُ اکبر " ٹھیرایا گیا ہے اور ایک مسلمان کے لیے یہ مستحب قرار دیا گیا ہے کہ جب وہ بلند مقامات پر مثلاً صفا و مروہ پر ہو، یا کسی اونچائی پر چڑھ رہا ہو، یا کسی جانور پر سوار ہو رہا ہو، تو تکبیر لیے اور اللہ جل شانہ کی کبریائی کا اعلان کرے۔ اس تکبیر میں وہ زور و قوت ہے کہ اس سے بھڑکتی ہوئی آگ کے بلند

سے بلند شعلے سرد پڑ جاتے ہیں اور شیطان اس کو سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ :-

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ — مجھے پکارو، میں تمہاری التجائیں سنوں گا،

یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ — یقیناً جو لوگ بڑے بنتے اور میری بندگی سے منہ

جَھَنَّمَ دٰخِرِیْنَ (غافر) — موڑتے ہیں وہ جلد ہی ذلت کے عالم میں داخلِ جہنم ہوں گے۔

کبر کے ساتھ شرک کا وجود ضروری ہے

لیکن جو شخص خدا کی بندگی سے منہ موڑتا ہے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ وہ "بندگی" سے مطلقاً آزاد ہو جاتا ہے، بلکہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی غیر اللہ کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہو۔ کیونکہ انسان کوئی بے حس اور جامد شئے نہیں ہے، بلکہ یہ فطرۃً ایک حساس اور متحرک ہستی ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ "حارث" اور "ہمام" "سب سے زیادہ سچے اور ثابت الوجود" اسماء، یعنی انسانی صفات ہیں۔ "حارث" کے معنی ہیں کمانے والا اور حرکت و عمل کرنے والا، اور "ہمام" کے معنی ہیں ارادہ کرنے والا۔ پس "ارادہ" انسان کی ایک دائمی صفت ہے جس سے وہ کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہر ارادہ کا ایک "مقصود" اور "مراد" کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ ان دونوں مقدموں کو تسلیم کر لینے کے بعد اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ہر انسان کا ایک محبوب اور مقصود ہونا چاہئیے، جو اس کی محبتوں کا محور اور ارادوں کا مرکز ہو۔ اب اگر کسی شخص کا معبود و محبوب اللہ تعالیٰ نہ ہو گا اور وہ خدا کی محبت اور نیاز مندی سے اپنے کو برتر اور بے نیاز سمجھتا ہو گا تو کوئی نہ کوئی غیر اللہ اس کا "مراد" اور محبوب ضرور ہو گا جو اس کو اپنا غلام اور "بندہ" بنائے ہوتے ہو گا۔ مثلاً مال و زر، یا شان و شوکت، یا حسن جمال، یا خدا کے سوا اس کا خود ساختہ کوئی اور معبود، جیسے چاند، سورج، ستارے، مورتیاں، انبیاء و صلحاء کی قبریں وغیرہ، یا کوئی نبی، یا فرشتہ یا کوئی

اور شے جس کا وہ خدا کو چھوڑ کر پجاری ہو۔ اب جب کہ وہ کسی نہ کسی غیر اللہ کا پرستار بنا ہوا ہے تو پھر اس کے مشرک ہونے میں کون سی کسر رہ گئی؟ معلوم ہوا کہ جو متکبر ہوگا مشرک ضرور ہوگا۔ فرعون کی مثال اس حقیقت کی ایک زندہ شہادت ہے جو دنیا کا عظیم ترین متکبر گزرا ہے لیکن جو ساتھ ہی مشرک بھی تھا۔ پہلی چیز یعنی اس کے استکبار کا ذکر متعدد آیات میں بالتفصیل موجود ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ...... وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ..... كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ۔ (سورہ غافر)

اور فرعون نے کہا مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور ذرا اب وہ اپنے رب کو بلائے ...... اور موسیٰ نے کہا کہ میں ہر اس متکبر سے جو حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمہارے رب کی پناہ پکڑتا ہوں .... اسی طرح اللہ تعالےٰ ہر متکبر اور ظالم کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَلَقَدْ جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ۔ (عنکبوت)

اور قارون اور فرعون اور ہامان، جن کے پاس موسیٰ روشن دلائل لے کر آئے تھے لیکن انھوں نے خدا کے ماننے اور اس کی بندگی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور سرزمینِ مصر میں کبر و غرور کی روش اختیار کیے رکھی، حالانکہ وہ ہم سے پیش پانے والے نہ تھے۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ (نمل)

جب ان کے پاس ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو نرا جادو ہے، اور ان کو ماننے سے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دل انکی صداقت پر یقین رکھتے تھے، سو دیکھو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا؟

دوسری چیز ہمیں یعنی یہ کہ فرعون مشرک تھا، یہ آیت گواہ ہے :-

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ	اور فرعون کی قوم میں سے بڑے لوگوں نے فرعون
أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا	سے کہا کہ آپ موسیٰؑ اور اس کی قوم کو یوں ہی
فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ	چھوڑے رہیں گے، تاکہ وہ ملک میں فساد انگیزی
(اعراف)	کریں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں ۔ ۹

نہ صرف یہ کہ ہر متکبر مشرک ہوتا ہے، بلکہ استقراء اور تجربہ بتلاتا ہے کہ جو شخص خدا کی بندگی اور اطاعت سے جتنی ہی زیادہ سرکشی کرتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ پکا مشرک ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ کی بندگی سے وہ جس قدر زیادہ سرتابی کرتا رہتا ہے اسی قدر زیادہ اپنے کسی نہ کسی ایسے مراد و محبوب کا محتاج اور نیاز کیش ہوتا جاتا ہے جو اس کے دل و دماغ کا اولین مقصود اور مطلوب ہو، اور اس طرح وہ اپنے اس لات و منات کا اسی مناسبت سے زیادہ پختہ پجاری بن جاتا ہے۔ کیونکہ، جیسا کہ کہا جا چکا، یہ چیز انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ اس کا دل اپنا کوئی نہ کوئی مقصود و مطلوب بالکل نہ رکھتا ہو۔ اس لیے جب مقصودِ حقیقی یعنے اللہ تعالیٰ کو اس نے اپنے قلب سے نکال پھینکا تو ضرور ہے کہ کوئی دوسری شے اس خالی جگہ پر قبضہ کر لے۔ ورنہ تمام مخلوقات اور ہر غیر اللہ سے قلبِ انسانی کا خالی اور بے نیاز نہ ہو رہنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا آقا و مولیٰ نہ بن جائے ـــــ ایسا آقا اور مولیٰ، جس کے سوا وہ کسی کی عبادت نہ کرے، کسی سے مدد نہ مانگے، کسی پر توکل نہ کرے، صرف اسی چیز کو پسند کرے جو خدا کو محبوب ہو اور اسی شے کو بری سمجھے جو خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہو، خدا کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھے اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن قرار دے، اسی کے لیے محبت کرے اور اسی

کے لئے نفرت ۔ اسی صفت باطنی کا نام اخلاص دین ہے ۔ یہ اخلاص جتنا زیادہ گہرا اور مضبوط ہوگا خدا کی عبدیت اتنی ہی زیادہ کامل، اور ما سوا سے بے نیازی اسی قدر مکمل ہوگی۔ یوں کمالِ عبدیت کا حصول ہی کبر اور شرک کا واحد علاج ہے۔

یہی دونوں بیماریاں ہیں جو اہلِ کتاب میں پیدا ہوگئی تھیں۔ نصاریٰ پر شرک غالب تھا اور یہودیوں پر کبر۔ جیسا کہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔ نصاریٰ کے متعلق فرمایا گیا ہے :۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (توبہ)

ان لوگوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیا ہے، اور مسیح ابن مریم کو۔ حالانکہ انھیں حکم صرف یہ دیا گیا تھا کہ اسی ایک معبود کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی دوسرا معبود ہے ہی نہیں۔ پاک و برتر ہے اللہ ان کے شریک ٹھیرانے سے۔

یہود کے بارے میں فرمایا کہ :۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (بقرہ)

تو کیا جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشوں کے خلاف پیغام لے کر آیا تم خود سری ہی اختیار کر بیٹھے چنانچہ ان میں سے کچھ کو تو تم نے جھٹلا دیا اور کچھ کو یہ قتل (بھی) کر رہے ہو

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا

میں اپنی آیتوں (پر ایمان لانے) سے ان لوگوں کو دور ہی رکھوں گا جو دنیا میں بغیر کسی استحقاق کے بڑے بنتے ہیں اور اگر یہ لوگ ایک نشانی

وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا (اعراف)

دیکھ لیں جب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے۔ اگر ہدایت کا راستہ دیکھتے ہیں تو اس کو اپنا راستہ نہیں بناتے۔ لیکن اگر گمراہی کی راہ دیکھ پاتے ہیں تو اس پر چل پڑتے ہیں۔

ہر نبی کا دین اسلام تھا

چونکہ کبر شرک کو مستلزم ہے، اور شرک اسلام کی عند اور گناہ عظیم ہے، جس کی معافی کا بارگاہِ احدیت میں حسبِ اعلانِ قرآنی، کوئی امکان نہیں، اس لیے ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انبیاء آئے، سب اسی دین "اسلام" کو لے کر آئے۔ بنابریں تنہا یہی وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:-

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (یونس)

اگر تم میری بات ماننے سے روگردانی کرتے ہو تو جانے تعجب ہے اس میں میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے، اور مجھے حکم ہے کہ میں "اسلام" اختیار کرنے والوں میں سے ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام کی دعوت و ارشاد اور طرزِ عمل کے متعلق قرآن میں ہے کہ:-

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَوَصّٰى بِهَا اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (بقرہ)

جب اس کے پروردگار نے اس سے کہا کہ "مسلم" (اطاعت گزار) بن جا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے پروردگار کائنات کے لئے اپنی گردن جھکا دی، اور پھر اسی امر کی اس نے اپنے بیٹوں کو، اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے اس دین کو پسند فرمایا ہے سو تم مرتے دم تک مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہی رہنا۔

یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (یوسف) — خدایا! مجھے دنیا سے "مسلم" اٹھا اور نیکوکاروں کے زمرہ میں داخل کر۔

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہیں :۔

یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۔ (یونس) — اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم "مسلم" ہو۔

توراۃ کے سلسلے میں اللہ تعالے فرماتا ہے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل، جو توراۃ کی شریعت کے مبلغ اور پیرو تھے ان کا دین یہی اسلام تھا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا ۔ (مائدہ)

بلقیس کے سامنے جب صداقت کی تجلی چمکی تو پکار اٹھی :۔

رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (نمل) — مالک! یقیناً میں نے اب تک اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا، اور اب سلیمانؑ کے ساتھ تمام جہانوں کے پروردگار، اللہ، کی "مسلم" بنتی ہوں۔

حواریین عیسیٰؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے :۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (مائدہ) — اور یاد کرو جب میں نے حواریوں کو وحی کی تھی کہ مجھ پر اور میرے رسولؑ پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ ہم ایمان لائے، اور اے خدا! گواہ رہ کہ ہم (تیرے) "مسلم" ہیں۔

قرآنِ حکیم کی ان تصریحات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اسلام

تھا۔ اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ کا یہ اعلان ہے کہ اسلام کی شاہراہ ہی وہ تنہا شاہراہ ہے جو میری بارگاہ مقبولیت تک پہنچاتی ہے :۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران)
بے شک اللہ کے نزدیک (پسندیدہ اور مقبول) دین اسلام ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (آل عمران)
اور جس شخص نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کیا اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائیگا۔

اسلام دین کائنات ہے

نہ صرف یہ کہ ہر نبی اسلام لے کر آیا تھا اور تمام بنی آدم کا یہی دین رہا ہے، بلکہ اسلام ساری کائنات کا دین ہے قرآن کہتا ہے:۔

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا (آل عمران)
کیا یہ لوگ اللہ کے دین کو چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں ؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے اپنی خوشی اور ارادے سے یا بجبر اسی کا "مسلم" (فرمان بردار) ہے۔

"طَوْعًا وَّکَرْھًا" کی قید کل کائنات کے "مسلم" ہونے میں اس وجہ سے لگائی گئی ہے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی مکمل تابع اور زیرِ فرمان ہیں، خواہ کوئی اس فرمانبرداری کا اقرار کرے یا نہ کرے، نیز تمام کے تمام اس کے سامنے عاجزِ محض ہیں اور اس کے دستِ تصرف و تدبیر میں ہیں، اس کے فرامینِ مشیت اور احکامِ تدبیر سے انحراف کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اس لیے چار و ناچار سب اسی کے "مسلم" اور تابع فرمان ہیں۔ ساری طاقتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ ایک ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چھوٹی بڑی چیز کا پروردگار وہی ہے جس طرح چاہتا ہے کسی روک ٹوک کے بغیر ان میں تصرف

کرتا رہتا ہے۔ سب کا پیدا کرنے والا، سب کو وجود بخشنے والا، اور سب کی صورتیں بنانیوالا وہی ہے۔ اس جہانِ ہستی میں اس کے سوا جو کچھ ہے سب کا سب مخلوق ہے، مربوب ہے، محتاج ہے، فقیر ہے، غلام ہے، مجبور ہے، مقہور ہے اور ہر حیثیت سے پابند ہے، اور وہی اکیلا ہر شے کا خالق اور صورت گر ہے۔ اگرچہ جس چیز کو بھی اس نے پیدا کیا ہے اسباب کے ساتھ پیدا کیا ہے، لیکن ان اسباب کا بھی پیدا اور مقدر کرنے والا وہی ہے۔ اس لیے وہ اسباب بھی اپنے عمل میں آزاد بالکل نہیں ہیں، بلکہ وہ بھی اس کے محتاج اذن ہیں۔ اس دنیا میں کام کرنے والا کوئی سبب بھی اپنی تاثیر میں مستقل بالذات نہیں ہے، بلکہ ہر سبب ایک "اور سبب" کا دستِ نگر ہوتا ہے، جس کی اعانت کے بغیر وہ اپنا فعل اور اثر بالکل ظاہر نہیں کر سکتا۔ یہ "اور سبب" یعنی علت العلل، ذاتِ باری تعالیٰ ہے، جو اسباب و علل سے بلند اور ہر شے سے بے نیاز ہے، جس کا نہ تو کوئی شریک ہے جو اس کی اعانت کرتا ہو، نہ کوئی مدمقابل ہے جو اس کے سامنے آسکتا ہو:۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ۭ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۭ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۔ (زمر)	اے نبیؐ ان سے کہو، کیا تم نے ان کے معاملہ پر کچھ غور کیا جنھیں خدا کو چھوڑ کر تم پوجتے ہو؟ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو دور کر سکتے ہیں؟ یا خدا مجھ پر کوئی رحمت نازل کرنا چاہے، تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک لے سکتے ہیں؟ کہہ دو کہ اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اسی پر بھروسہ کرنیوالے بھروسہ رکھا کرتے ہیں۔

اس طرح کی اور بھی بے شمار آیتیں قرآن میں موجود ہیں جو شہادت دیتی ہیں کہ ہر فعل

کی اور افعال کے ہر سبب کی باگ ڈور مشیتِ الٰہی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل نے اپنی قوم کی کٹ حجتیوں اور دھمکیوں کے جواب میں اسی حقیقتِ تاباں کو پیش فرمایا تھا جب یہ کہا تھا کہ "میں تمہارے شریک ٹھیرائے ہوئے معبودانِ باطل سے ڈرنے والا نہیں، ہاں اگر میرے پروردگار ہی کی مشیت کچھ اس قسم کی ہو تو اور بات ہے۔" (وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا) (انعام)

ابراہیم خلیل عبدیتِ کاملہ کا نمونہ عبدیت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک امتیازی شان اور اسوہ کمال رکھتے ہیں۔ خدا کی ساری زمین شرک کی ظلمتوں سے تاریک ہو رہی تھی کہ توحید، عبودیت اور اخلاص کا یہ نورانی پیکر حق پرستوں اور مخلصوں کا امام بن کر نمودار ہوا، جس کی عبدیتِ کاملہ کا خود اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں تذکرہ کرتا ہے:۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ۔ (بقرہ)	اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور اس نے ان کو پورا کر دیا، تو اس نے فرمایا کہ "میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔" ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں سے؟ جواب ملا کہ میرے وعدے کی وسعت ظالموں تک نہیں پہنچی!

غور کیجیے، یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم طریقہ پر اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ یہ وعدہ امامت صرف مومنوں اور حدودِ عبدیت کی حفاظت کرنے والوں کے لیے ہے۔ ظالموں کے لیے نہیں ہے۔ اور یہ معلوم ہی ہے کہ سب سے بڑا ظلم شرک ہے (إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ) (لقمان)

پس ظالموں اور مشرکوں کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز کیے جائیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامتِ اقوام کا شرف کمالِ عبودیت کی آزمائش میں کامیاب ثابت ہونے پر ملا تھا۔ چنانچہ آپ کو خدا پرستی کا معیاری نمونہ اور پیشوا قرار دیا گیا، اور آپ کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی عظیم ترین نعمت سے نوازا، اور آپ کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوا آپ ہی کی ملت پر مبعوث ہوا۔ چنانچہ خود نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ ہر طرف سے یکسو ہو کر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کرو (اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (نحل)

ایک اور جگہ یہود اور نصاریٰ کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل شدہ ہدایت کو یہودیت و نصرانیت کی گروہ بندیوں سے کوئی علاقہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی ہدایت تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی میں ہے (بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (بقرہ)

حدیث میں حضرت ابراہیمؑ کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ "ابراہیم خیر البریہ ہیں" معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ تمام مخلوق اور سارے انبیاء سے افضل ہیں چنانچہ دربارِ خداوندی سے آپ کو "خلیل اللہ" کا خطاب عطا ہوا ہے، جس سے بڑا کوئی عزت خطاب اور کوئی نہیں۔

خلت کا مفہوم

اس امر کی دلیل کہ "خلیل" سے بڑا کوئی خطاب نہیں، خود "خلیل" اور "خلت" کے الفاظ ہی میں موجود ہے۔ "خلت" نام ہے خدا کے ساتھ بندے کی انتہائی محبت کا جو کمالِ عبودیت کو مستلزم ہو، نیز بندہ کے ساتھ خدا کی اس کامل محبت کا جو بندے کے لیے اس کی کامل ربوبیت کو لازم ہو۔ اور "عبودیت" جیسا کہ آغاز بحث میں تفصیل کے ساتھ بتلایا جا چکا ہے، انتہائی تذلل اور انتہائی محبت کے مجموعہ کا نام

ہے۔ اس لیے خلّت کا مقام محبت کے مقام سے زیادہ اونچا ہے۔ اور یہی وہ سب سے اونچا درجۂ کمال ہے جو حضرات ابراہیم اور حضرت محمد علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ کے دربار سے مرحمت ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس زمین پر بسنے والوں میں سے کوئی "خلیل" نہ تھا، جیسا کہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ "اگر میں اہل دنیا میں سے کسی کو اپنا خلیل منتخب کرتا تو وہ ابوبکرؓ ہوتے، لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کا خلیل ہو چکا ہوں"۔ معلوم ہوا کہ انسان کسی ایک ہی کا خلیل بن سکتا ہے، اور خلّت قابلِ شرکت چیز نہیں۔ خلّت کے مفہوم کو ایک نکتہ داں شاعر نے کس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے ؎

قد تخللت مسلک الروح منی — و بذا سمی الخلیل خلیلا

(میری محبوبہ میرے اندر روح کی طرح تخلیل پذیر ہو گئی اور یعنی سرایت کیے ہوئے ہے، اسی وجہ سے خلیل کو خلیل کہتے ہیں)

محبّت اور خلّت میں فرق

محبت اور خلّت میں یہی فرق ہے کہ خلّت شرکتِ غیر کی متحمل اور روادار نہیں ہوتی جبکہ محبت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ خلّت صرف ایک سے ہو سکتی ہے لیکن محبت ایک سے زائد اشخاص سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے رشتۂ خلّت رکھنے کے باعث جہاں کسی ماسوا کو اپنا خلیل بنانے سے انکار فرمایا تھا وہیں اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے کے باوجود بہت سے انسانوں کو بھی اپنا حبیب قرار دیا تھا۔ مثلاً حضرت حسنؓ اور حضرت اسامہؓ کے متعلق فرمایا کہ "خدایا! میں ان سے محبت رکھتا ہوں سو تو بھی ان سے محبت رکھ" اسی طرح عورتوں میں سے حضرت عائشہؓ اور مردوں میں سے حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے اپنا سب سے بڑھ کر محبوب قرار دیا۔ کلامِ رسولؐ کے بعد کلامِ الٰہی پر نظر ڈالیے تو جگہ جگہ دکھائی پڑتا ہے کہ "اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے" "اللہ محسنوں سے محبت

رکھتا ہے "۔ " اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے "۔ " اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن کو وہ محبوب رکھتا ہوگا اور جو اس کو محبوب رکھتے ہوں گے "۔ اپنے اس ارشاد سے اللہ تعالیٰ بتانا یہ چاہتا ہے کہ سچے مومن وہ ہوتے ہیں جن سے خدا محبت رکھتا ہے اور جو خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا " ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں "۔ جس سے ثابت ہوا کہ مومن صالح اگرچہ سب سے زیادہ خدا ہی سے محبت رکھتا ہے مگر دوسروں سے بھی محبت رکھ سکتا ہے۔ جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ محبت میں وحدت ضروری نہیں، بخلاف خلت کے۔

ایک عام خیال کی تردید

عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حبیب تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل تھے، اور یہ کہ "محبت" کا مقام "خلت" کے مقام سے اونچا ہے۔ لیکن یہ خیال کوئی مضبوط بنیاد نہیں رکھتا۔ کیونکہ احادیث صحیحہ سے یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ آنحضرتؐ بھی اللہ کے خلیل تھے۔ صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے، اور مختلف سندوں کے ساتھ موجود ہے، کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا خلیل بنایا ہے،

جیسا کہ اس نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنایا تھا"۔

اسی طرح ایک اور بھی حدیث اوپر گزر چکی ہے، جس میں آپ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ میں اللہ کا خلیل ہو چکا ہوں اور اب کسی اور کو خلیل بنانے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔

ایمان کی لذت اور حلاوت

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ محبت الٰہی سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں اور کاموں کو پسندیدہ رکھا جائے جو

اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ محبتِ الٰہی کی یہ تاویل ہم نے نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں صحیحین کی مذکورۃ بالا احادیث کے پُرحکمت الفاظ پر دوبارہ غور کیجئے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "تین چیزیں جس کسی کے اندر موجود ہوں گی وہی حلاوتِ ایمانی سے شادکام ہوگا .... الخ"۔

ایسا فرمائے جانے کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز میں لذت، انسان اسی وقت محسوس کرتا ہے جبکہ اس کے دل میں اس کی محبت گھر کر چکی ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی چیز کی محبت اور خواہش رکھتا ہے تو جس وقت وہ چیز اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک کیفیت، ایک حلاوت، ایک لذت اور ایک سرور محسوس کرتا ہے۔ "لذت" اس خاص کیفیت کا نام ہے جو کسی موافقِ طبع اور مرغوب شے کے ادراک اور حصول کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ بعض خام کار فلسفیوں اور طبیبوں کا یہ خیال، کہ لذت، مرغوب شے کے ادراک اور حصول ہی کا دوسرا نام ہے، ایسا پھسپھسا اور بے اصل ہے کہ اس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ "ادراک اور حصول"، تو رغبت اور لذت کے بیچ کی کڑی ہے، نہ کہ نفسِ لذت۔ مثال کے طور پر کھانے کا مسئلہ لیجئے۔ کھانا انسان کی ایک مرغوب چیز ہے، جب وہ اس کھانے کو کھاتا یا کھالیتا ہے تو ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ پھر یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ کھانا کھانا ہی لذت ہے۔ اسی طرح قوتِ باصرہ کو لیجئے۔ جب انسان کسی محبوب شے کو دیکھتا ہے تو دیکھنے کے بعد اس سے لذت پاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ لذت کا حصول دیکھنے اور نظر ڈالنے کے بعد ہوتا ہے۔ پس نظر دوسری چیز ہوئی اور لذت اور چیز، جو نظر کے بعد وجود میں آئی۔ الفاظ بھی اسی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں:۔

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ۔ (زخرف)	اور اس بہشت میں وہ نعمتیں ہیں جن کی دلوں کو آرزو ہوگی اور جن سے آنکھیں لذت اندوز ہوں گی۔

معلوم ہوا کہ دیکھنے ہی کا نام لذت نہیں ہے، ورنہ یوں نہ فرمایا جاتا کہ "آنکھیں ان کو دیکھ کر لذت اندوز ہوں گی"۔

یہی حال دوسرے تمام احساسات کا ہے۔ نفس کو جو بھی کیفیتیں خوشی یا غم وغیرہ کی محسوس ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی پسندیدہ یا ناپسندیدہ چیز کے احساس وادراک کا نتیجہ ہوتی ہیں، نہ کہ نفس احساس وادراک۔ لہٰذا ایمان کی حلاوت کا، اور پھر اس کی لذت وسرور کا حصول اللہ تعالیٰ سے کامل محبت کا ثمرہ ہوتا ہے، جو تین باتوں میں پورا اترنے کے بعد میسّر ہوتا ہے :۔ ایک تو اس محبت کی "تکمیل"، دوسری اس محبت کی "تفریع" تیسری اس محبت "ضد سے نفرت اور اس کا مقابلہ"۔ "تکمیل محبت" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول ساری موجودات سے زیادہ محبوب ہوں۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا، اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت کے باب میں صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ ان سے بس فی الجملہ محبت رکھی جائے، بلکہ ضروری ہے کہ ان کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ "تفریع محبت" کا مدعا یہ ہے کہ اگر بندہ کسی اور کی محبت کرے تو وہ محبت بھی اللہ کے لئے ہو، بالاصل نہ ہو۔ "محبت یا محبوب کی ضد سے نفرت" کا مفہوم یہ ہے کہ ضدِ ایمان —— کفر وشرک —— کو آگ میں جا پڑنے سے بڑھ کر ناپسندیدہ سمجھے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ رسولؐ خدا کی اور مومنوں کی محبت بھی دراصل خدا ہی کی محبت ہے، یعنے اسی کا جزء یا اس کا پرتو ہے، اور یہ کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان مومنوں سے محبت رکھتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے انعام سے سرفراز کیا تھا، اور ان سے آپؐ کی یہ محبت اسی وجہ سے تھی، کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت تھی، اس لئے لازماً اللہ کے محبوبوں کی محبت اور اس کے مبغوضوں کا بغض بھی آپ کے قلبِ مبارک

میں سب سے زیادہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ اب محبت کے بالمقابل خلّت کا حال دیکھیے کہ کس طرح اس میں غیر اللہ کے لئے ایک شمّہ بھی حصہ نہ تھا، نہ اصلاً نہ تبعاً، بلکہ وہ اللہ ہی کے لیے مخصوص تھی۔ اس سے محبتِ مطلق پر خلّت کی برتری روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔

محبتِ الٰہی کے باب میں فکر و عمل کی کوتاہیاں

خلاصہ کلام یہ کہ خدا کی محبت اور خلّت ہی میں عبودیتِ الٰہی کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ لیکن کتنے ہی اہل علم و نظر ایسے گزرے ہیں جو اس حقیقت سے دور جا پڑے۔ ان کا گمان ہے کہ عبودیت تو صرف تذلل اور خضوع کا ایک خشک وظیفہ ہے، اس میں محبت کی چاشنی کہاں ہے؟ کیونکہ محبت تو ایک قلبی تمناؤں کی انبساطی کیفیت کا، اور دوسرے کی طرف سے ناز و انداز کے اظہار کا نام ہے، اور ظاہر ہے کہ ذاتِ باری اس قسم کی باتوں سے بالکل ہی ماوراء ہے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک محبوب یا مُحِب کی حیثیت دی جائے! لیکن یہ خیال دراصل محبتِ الٰہی کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ یہی اندیشہ غلط فہمی تھا جس کے پیشِ نظر حضرت ذوالنون مصریؒ نے اپنے سامنے محبتِ الٰہی کا ذکر چھیڑنے پر فرمایا تھا کہ "خاموش رہو، اس مسئلہ پر گفتگو مت کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ عام لوگوں کے کانوں تک بات پہنچے اور وہ محبتِ الٰہی کا ادعا کرنے لگیں۔" چنانچہ بعض علماء نے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا مکروہ فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خشیت کا ذکر اور تصور کیے بغیر اس کی صرف محبت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ایک بزرگ کا قول لوحِ دل پر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے جنھوں نے فرمایا ہے کہ "جو شخص خدا کی عبادت صرف محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ زندیق ہے، اور جو صرف رجا (امید) کے ساتھ کرتا ہے وہ مرجی ہے، اور جو صرف خوف کے ساتھ کرتا ہے وہ حروری ہے۔ مومنِ موحّد وہ ہے جس نے خدا کی عبادت

محبت، خوف اور رجا تینوں کے ساتھ کی۔ واقعات اس حکیمانہ نکتہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ چنانچہ صوفیائے متاخرین میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جنھوں نے ادعائے محبت میں اپنی حدود کو فراموش کر دیا اور ان سے باہر نکل گئے۔ یہاں تک کہ ان میں ایک طرح کی رعونت پیدا ہوگئی، اور وہ ایسے دعوے کر بیٹھے جو عبدیت کے منافی ہیں، اور جن میں ایسی شانِ ربوبیت پائی جاتی ہے جو اللہ جل وعجدہٗ کے سوا کسی کو حاصل ہی نہیں۔ انھوں نے اپنے کو اس مقام پر ظاہر کیا جو نبوت و رسالت کے مقام سے بھی بالاتر ہے، اور اپنے لیے خدا سے ایسی صفات کا مطالبہ کر گئے جو اللہ ہی کے لیے مخصوص ہیں، اور جن کے انبیا بھی مستحق نہیں۔ یہ وہ خطرناک غلطی ہے جس کے شیطانی جال نے بڑے بڑے شیوخِ طریقت کو شکار کر لیا۔

اس غلطی میں مبتلا ہونے کا سبب عبودیت کی حقیقت کا نہ سمجھنا اور عبادت کا حق نہ ادا ہونا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا سبب اُس عقل کی کوتاہی ہے جس کے بغیر ایک بندہ اپنی حقیقت پہچان ہی نہیں سکتا۔ جب عقل خام کار ہوتی ہے، اور دین کا علم پوری طرح حاصل نہیں رہتا، ایسی حالت میں اگر نفس میں محبتِ الٰہی کے جذبات پیدا ہو جائیں تو وہ اپنی نادانی کے باعث اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے، اس کو اپنی حدود یاد نہیں رہتیں ـــ چنانچہ عشقِ مجازی میں ہم اس انسانی کمزوری کا مشاہدہ جب چاہیں کر سکتے ہیں ـــ امر جب نفس فریبِ شیطانی کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی زبان سے بڑے بول نکلنے لگتے ہیں ـــ وہ علانیہ کہنے لگتا ہے کہ میں تو عاشقِ خدا ہوں، میں جو چاہوں کروں، میری کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ لیکن ظاہر ہے، یہ بنیادی اور کھلی ہوئی گمراہی ہے، اور بالکل وہی بات ہے جو یہود اور نصاریٰ کی زبانوں سے نکلی تھی کہ "ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں" اور جس کا جواب خدا نے یہ دیا تھا کہ "تم اس کے بیٹے اور محبوب ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہو،

مگر یہ تو بتاؤ کہ پھر وہ تمہیں عذاب کیوں دیا کرتا ہے؟ کیا "بیٹے اور محبوب ہونے" کی یہی علامتیں ہیں؟ پس یہ نفس کا ایک خطرناک فریب ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جو اللہ کا واقعی محبوب ہوتا ہے اس کو وہ صرف ایسے ہی کاموں میں لگاتا ہے جو اس کی رضا کے موجب ہوں، وہ کبھی ایسے کام نہیں کرتا جو اس کی ناراضی کا سبب بنیں رہا ایسا شخص جو کبائر کا ارتکاب کرتا رہتا ہے اور نافرمانیوں پر نافرمانیاں کرتا جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ان افعال بد کو بھی اسی طرح نفرت اور غصہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح کہ اس کے اچھے اعمال کی قدر و محبت کرتا ہے۔ کیونکہ خدا کسی بندے سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنا کہ اس میں ایمان اور تقویٰ ہے۔ اور اس شخص کی مثال، جو گمان کرتا ہے کہ محبوب خدا (یا عاشق خدا) ہونے کے باعث گناہ اسے کوئی نقصان ہی نہیں پہنچا سکتے، اس خوش فہم کی سی ہے جو سمجھتا ہو کہ چونکہ میرا مزاج معتدل اور میری صحت جسمانی بالکل ٹھیک ہے اس لیے میں خواہ کتنا ہی زہر کیوں نہ کھالوں، اور پھر مسلسل کیوں نہ کھاتا رہوں اس سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اگر یہ عقل کا دشمن قرآن پر نظر ڈالتا اور انبیائے کرام کے احوال و قصص کو تدبر کی نگاہ سے دیکھتا کہ کس طرح نوع انسانی کے ان سرتاجوں کو بھی کبھی کبھی توبہ و استغفار کی ضرورت پیش آہی گئی اور خدا کے ان محبوب ترین بندوں کو بھی اپنے اپنے حالات کے مطابق، تزکیۂ نفس کی خاطر ابتلاؤں اور مصیبتوں کی بھٹی سے گزرنا ہی پڑا ـــــ تو اسے معلوم ہو جاتا کہ گناہ اپنی ضرر رسانی میں اتنے مستعد، اور اپنے ثمرات مرتب کرنے میں اتنے بے رحم واقع ہوئے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے مقرب بندے کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اور یہ بات عین مقتضائے فطرت بھی ہے۔ خود انسان، انسان کے تعلقات میں اس اصول کی کارفرمائی مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ ایک شخص کا عاشق اگر اس کی، یعنی اپنے محبوب کی، مرضی اور مصلحت سے واقف نہیں ہوتا اور اس کے

مطابق طریقِ کار اختیار نہیں کرتا، بلکہ صرف اپنے جذباتِ عشق کے اشاروں پر رقص کرتا رہے تو بالیقین اس کا یہ رویہ اپنے محبوب کی نفرت اور ناراضی کا، بلکہ عداوت اور تعذیب تک کا موجب ہو جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کتنے ہی اہلِ سلوک ایسے گزرے ہیں جو محبتِ الٰہی کے زعم میں طرح طرح کی خلافِ دین باتیں کہہ اور کر گئے۔ کہیں تو حدود اللہ کی پاسداری فراموش کر دی گئی، کہیں حقوق اللہ کو پسِ پشت ڈال دیا گیا، اور کہیں تو بے تکے اور باطل دعوے بھی کر دیے گئے۔ کوئی صاحب فرما گئے کہ "میرے جس کسی مرید نے ایک شخص کو بھی دوزخ میں رہنے دیا، اس سے میں بری ہوں" کسی نے کہا کہ "جس کسی مرید نے ایک مومن کو بھی دوزخ میں جلنے دیا میں اُس سے بیزار ہوں" ایک تیسرے صاحب یہ سُنا گئے کہ "قیامت کے دن میرا خیمہ جہنم کے دروازے پر نصب رہے گا، تاکہ ایک شخص بھی اس کے اندر داخل نہ ہونے پائے" یہ اور اسی طرح کے بے شمار اقوال بعض مشہور و معروف مشائخ کی طرف منسوب ہیں۔ جو یا تو ان بزرگوں پر سراپا بہتان ہیں، یا اگر فی الواقع انہی کے اقوال ہیں تو یقیناً وہ بالکل ہی لغو ہیں، جو ہوش کی نہیں بلکہ حالتِ سکر (یا غلبہ یا فنا کی) باتیں ہیں، جس میں انسان ہوش اور تمیز کھو بیٹھتا ہے، یا کم از کم یہ کہ اس کی تمیز اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ نہیں جان پاتا کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے حالتِ خاص کے زائل، اور ہوش و تمیز کے بجا ہو جانے کے بعد اس قسم کی باتوں سے توبہ و استغفار کیا۔ یہی معاملہ ان صوفیوں کا بھی ہے جنھوں نے عشقیہ قصائد سننے میں اپنے لیے گنجائش پیدا کی۔

محبت کا صحیح معیار

عشق و محبت کی راہ کے یہی وہ خطرات تھے جن سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے محبت کی ایک کسوٹی مقرر فرما دی

ہے، تاکہ ہر مدعی کا دعوائے محبت اس پہ پرکھ کر دیکھا جا سکے، فرمایا:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (سورۂ آلِ عمران)

کہو، اگر تم واقعی خدا سے محبت رکھنے والے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

گویا وہی شخص خدا کی محبت کا سچا دعویدار کہا جا سکتا ہے جو اُس کے رسول کے ایک ایک نقشِ قدم کو اپنا ہادی بنائے۔ اور یہ حقیقت کسی بحث یا تشریح کی محتاج نہیں کہ رسول کی اطاعت اور پیروی ہی عبودیت کا حقیقی مظہر ہے۔

قرآن نے ایک قدم آگے بڑھا کر حُبِ الٰہی اور حُبِ رسول کا ایک اور نمایاں معیار مقرر فرما دیا ہے، اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاد کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے انتہائی شیفتگی ہو اور اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے پوری پوری نفرت ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں کا، جو اس کے محبوب ہیں اور جن کا وہ محبوب ہے، نشانِ امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ:۔

- اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (سورۂ مائدہ)

وہ مومنوں کے لئے نہایت فروتن ہوتے ہیں اور کافروں کے لئے نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس امت کی محبت اور عبودیت پچھلی امتوں کے مقابلہ میں زیادہ کامل ہے اور اس اُمت کے اندر اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لوگوں کی نسبت، اللہ کی محبت اور عبودیت میں زیادہ کامل ہیں، یا پھر وہ لوگ جو ان اصحابِ رسولؐ کا سچا مونہ بن جائیں، جو ان سے جتنی ہی زیادہ عملی ہمرنگی پیدا کرے گا اتنا ہی زیادہ محبت اور عبودیت میں کامل ہوگا۔

محبتِ الٰہی کا یہ معیار اور عملی مظہر سامنے رکھیے۔ پھر ان لوگوں کے اقوال اور کردار پر نظر ڈالیے جو اپنے کو خدا کی محبت کا، اور اس کی محبوبیت کا اجارہ دار سمجھتے ہیں، حالانکہ رسول کی سنت کی اور اس کے احکام کی اطاعت کی دن رات دھجیاں اڑاتے رہتے ہیں، اور ایسے عقائد و تصورات رکھتے ہیں جو دین و شریعت کی بنیاد ہی ڈھا دینے والے ہیں۔

اتباعِ شریعت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی وہ سب سے بڑا فرق و امتیاز ہے جو خدا کے سچے عاشقوں اور جھوٹے مدعیوں کے درمیان پایا جاتا ہے، اور جس کے ذریعہ ان اولیاء اللہ کے جو فی الواقع خدا کے مُحِب اور محبوب ہیں، اور ایسے مدعیانِ محبت کے درمیان تمیز کی جا سکتی ہے جو دعوائے محبت کے ساتھ مخالفِ شرع باتوں اور اپنے جی کی گھڑی ہوئی بدعتوں کا اتباع کرتے رہتے ہیں، یا جو محبت کا یہ خود ساختہ مفہوم لیتے ہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت کی جائے حتّٰی کہ کفر و فسق و عصیان جیسی چیزوں سے بھی۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ خطرناک نظریۂ محبت تھا جس نے یہود اور نصاریٰ کو ڈبو دیا تھا۔ ان نام نہاد "صوفیائے اسلام" کا دعوائے محبت بھی اہلِ کتاب کے ادعائے محبت جیسا ہے جو کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور لاڈلے ہیں۔ اگرچہ اس لحاظ سے، کہ ان کا کفر اُن کے کفر کی حد تک نہیں پہنچا ہے، انھیں یہود و نصاریٰ کے برابر گمراہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ ان حضرات کا دعویٰ اُن یہودیوں اور نصرانیوں کے دعوے سے بھی بدتر اور مہلک تر ہے، کیونکہ اس کے اندر شریعت کی مخالفت کے ساتھ ساتھ نفاق کے جراثیم بھی موجود ہیں، اور معلوم ہے کہ منافقین کا ٹھکانا دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوگا۔

محبتِ الٰہی کی تعلیم توراۃ اور انجیل میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح قرآن میں۔

اور اگرچہ ان کتابوں کے الفاظ و عبارات اور اصل تعلیمات کے بارے میں ان کے پیروؤں کے درمیان شدید اختلافات ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ محبتِ الٰہی کی تعلیم کے واقعی ہدایتِ ربانی ہونے میں کسی گروہ کو اختلاف نہیں۔ بلکہ یہ تعلیم ان کے ہاں "ناموس" کی سب سے بڑی اور بنیادی وصیت تسلیم کی جاتی ہے۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسٰی نے فرمایا "مسیح کی سب سے بڑی وصیت یہ ہے کہ تو خداوند کی محبت کر، اپنے پورے قلب اور اپنی پوری عقل اور اپنی پوری روح کے ساتھ۔" چنانچہ آج بھی نصاریٰ کو اس امر کا دعویٰ ہے کہ وہ اس حبِ الٰہی پر قائم ہیں اور ان کے اندر جو زہد اور عبادت پائی جاتی ہے وہ اسی وصیت کا اثر ہے لیکن واقعہ کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت سے بالکل تہی دامن ہو چکے ہیں، کیونکہ وہ ان باتوں پر عمل نہیں کرتے جو خدا کو پسند ہیں، بلکہ ان چیزوں پر عمل کرتے ہیں جو خدا کو مبغوض ہیں، انھیں رضائے الٰہی کی پرواہی نہیں۔ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالےٰ نے ان کے سارے اعمال حبط کر دیئے ہیں۔ ادھر وہ محبوبیت کے نشہ میں مست ہیں، اُدھر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے باغیوں اور ملعونوں کی فہرست میں شامل کر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت تو یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنا محبوب اور لائقِ لطف و کرم بناتا ہے جو اس سے محبت رکھتے ہوں۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ بندہ تو خدا سے محبت رکھتا ہو اور خدا کو اس سے کوئی محبت نہ ہو! امرِ واقعی تو یہ ہے کہ خدا سے بندے کو جتنی محبت ہوتی ہے، خدا کو بھی اس سے اتنی ہی محبت ہوتی ہے، اور مزید عنایت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کا اجر اس کی مقدار سے کہیں زیادہ دیتا ہے، جیسا کہ حدیثِ قدسی میں ہے:۔

"جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں، اور جو مجھ سے ایک ہاتھ قریب آتا ہے میں اس سے ایک گز قریب ہو جاتا ہوں۔ اور

جو میری طرف پیدل آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں "

قرآن کو دیکھیے تو قدم قدم پر یہ الفاظ ملتے ہیں " اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے" اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے " " اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے" وغیرہ۔ نہ صرف یہ، بلکہ نصوص تو یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محبوبیت کی سندِ افتخار انہی لوگوں کو عطا فرماتا ہے جو واجبات سے گزر کر نوافل بھی کثرت سے ادا کرنے لگتے ہیں۔ مشہور حدیثِ قدسی ہے:۔

" بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے..... الخ "

اہلِ زہد و ریاضت کی خام خیالیاں

اللہ تعالےٰ کی محبوبیت اور محبت کا یہ اہلِ اسلامی معیار نگاہ میں رکھیے، اس کے بعد ایسے بزعم خود غلط " زہاد " کے مزعومات پر نظر ڈالیے جو اگرچہ زہد و عبادت کی چند مخصوص چیزوں پر بڑی تندہی کے ساتھ عمل پیرا رہتے ہیں، مگر کتنے ہی امور ایسے ہیں جن میں وہ شریعت کی خلاف ورزی بھی کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے کا تصور تک نہیں رکھتے، لیکن اس کے باوجود ...... مخالفِ شرع اور ترکِ جہاد کے باوجود ...... خدا کی محبت کے مدعی ہیں، اور بعض ویسی ہی خام خیالیوں میں مبتلا ہیں جن میں نصاریٰ مبتلا تھے۔ یہ لوگ اپنے اس طرزِ فکر و عمل کے اثبات میں اسی قسم کی باتوں سے حجت پیش کرتے ہیں جن کی نصاریٰ نے آڑ لی ہے۔ یعنے یا تو قرآن و حدیث کے متشابہ الفاظ کی حسبِ خواہش تاویلیں کرتے ہیں، یا پھر ایسے اقوال و حکایات پر اپنے استدلال کی عمارت اٹھاتے ہیں جن کے سلسلے میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ

وہ شخص بالیقین راست باز اور برسرِ حق ہی تھا جس کی طرف یہ اقوال و حکایات منسوب ہیں۔ اور اگر بربنائے حسنِ ظن اس کی راست بازی اور حقانیت تسلیم ہی کر لی جائے تو بھی اس امر واقعی سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ معصوم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اس کی باتوں کو وحیِ آسمانی کی طرح واجب الاتباع مانتے ہیں۔ جس کا، دوسرے لفظوں میں، مطلب یہ ہوا کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو شارعینِ دین کا مقام دے رکھا تھا یہ لوگ بھی اپنے مرشدوں اور پیشواؤں کو دراصل اپنا شارعِ دین سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نوبت کبھی کبھی یہاں تک بھی پہنچ جاتی ہے کہ یہ لوگ عبودیت کی جڑ پر کھلے بندوں آرہ چلا دیتے ہیں اور دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ خواص، بندگی کی حدود پار کر جاتے ہیں، جیسا کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کے بارے میں دعویٰ کرتے آرہے ہیں۔ حالانکہ دین تو نام ہے اللہ تعالیٰ کی کامل و مکمل عبدیت کے حقیقی عملی ظہور کا، اور عبدیت کاملہ عبارت ہے اللہ عزوجل کی انتہائی اور ہمہ گیر محبت سے۔ ایک کی کسی دوسری شے کی بھی کا قطعی ثبوت ہے۔ اس طرح غیر اللہ کی محبت بھی دراصل اس کی عبدیت کی، اور غیر اللہ کی عبدیت فی الحقیقت اس کی محبت کی دلیل ہے۔

۴ غیر اللہ کی محبت —— اگر وہ اللہ ہی کے لئے نہ ہو —— جبینِ حق کا داغ ہے، اور جس عمل کا مقصود رضائے الٰہی نہ ہو وہ سامانِ حسرت کے سوا کچھ نہیں۔ ایمان کی نگاہ میں یہ دنیا و مافیہا سب کا سب ملعون بجز اس چیز کے جو اللہ ہی کے لیے ہو۔ اور اللہ کے لئے کوئی چیز اگر ہو سکتی ہے تو صرف وہی جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو اور اللہ و رسول کو پسند وہی چیز ہوتی ہے جس کی رسولؐ نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی ہے۔ پس جو عمل خدا کے لئے نہ ہو وہ بھی مردود ہے (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ الخ) اور جو عمل اسوۂ رسولؐ کے مطابق نہ ہو وہ بھی مردود ہے (مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَیْسَ عَلَیْہِ اَمْرُنَا فَھُوَ رَدٌّ)۔

یہی دین اسلام کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد جتنی مستحکم ہوگی اتنی ہی دین کی حقیقت موجود ہوگی یہی مقصد تھا آسمانی کتابوں کے نزول کا، اور یہی غایت تھی انبیاءِ کرام کی بعثت کی۔ اسی کا آخری نبیؐ نے بھی پیغام سنایا، اور اسی کے لیے اس نے اپنے جسم و روح کی ساری قوتیں وقف کر رکھی تھیں۔

شرک کا خطرہ

اس مقامِ عبدیت تک پہنچنے میں نفسِ انسانی کی بعض زبردست کمزوریاں روک بن جاتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی اور بنیادی شے میلانِ شرک ہے۔ شرک نفسِ انسانی کی ایک عام اور قاہر بیماری ہے۔ یہاں تک کہ اُس امت میں بھی اس کے مخفی جراثیم پائے جاتے ہیں جو توحید کی تنہا علمبردار ہے، جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام اس سے محفوظ رہنے کی فکر سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "جب شرک چیونٹی کے پاؤں کی آہٹ سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے (جیسا کہ حضورؐ فرماتے ہیں) تو بھلا ہم اس کے حملے سے کیونکر بچ سکتے ہیں"؟ ارشاد ہوا کہ "آؤ میں ایک ایسا نسخۂ شفا بتاؤں جو تمہیں ہر چھوٹے بڑے شرک سے محفوظ رکھے گا، تم خدا سے دعا کیا کرو کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ وَ اَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَا اَعْلَمُ" (خدایا! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جانتے ہوئے بھی کسی کو تیرا ساجھی ٹھیراؤں اور اس شرک سے تیری مغفرت چاہتا ہوں جو نادانستگی میں سرزد ہو جاتا ہو۔)

حضرت عمرؓ یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ عَمَلِیْ کُلَّہٗ صَالِحًا وَاجْعَلْہُ لِوَجْھِکَ خَالِصًا وَلَا تَجْعَلْ لِاَحَدٍ فِیْہِ شَیْئًا" (اے اللہ میرے ہر عمل کو صالح اور اپنے ہی لیے خالص بنا، اور اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہ ہونے دے)۔

حُبِّ جاہ ومال

عبدیت کی راہ کا دوسرا روڑا جاہ ومال کی محبت ہے۔ نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نفسِ انسانی پر عموماً ایسی مخفی آرزوئیں چھائی رہتی ہیں، جو خدا کی حقیقی محبت وبندگی اور اخلاص کے پودے کو پروان چڑھنے نہیں دیتیں۔
شداد بن اوسؓ نے اہلِ عرب کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "اے اہلِ عرب! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ ریا اور مخفی خواہشِ نفس ہے"۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم ترین مہلکۂ ایمانی سے ان لفظوں میں متنبہ کیا ہے:۔

"دو ایسے بھوکے بھیڑیے، جو بکریوں کے کسی باڑے میں چھوڑ دیے جائیں، ان بکریوں کے لیے اتنے تباہ کن نہیں جتنی مال اور جاہ کی حرص، دین وایمان کے لئے تباہ کن ہے"۔ (ترمذی)

معلوم ہوا کہ جس سینہ میں سچا اور صحیح دین ہوگا اس میں حرصِ مال وجاہ کا وجود ممکن نہیں۔
وجہ اس کی یہ ہے کہ جب دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور عبودیت کا مزہ پالیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شے اس سے بڑھ کر مرغوب نہیں رہ جاتی، کہ وہ اس کی طرف مائل ہوسکے۔ یہی وہ چیز ہے جو اہلِ اخلاص کے لیے برائیوں اور بدکاریوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنتی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم سے مترشح ہوتا ہے:۔

كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُۥ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ (یوسف)	اسی طرح، تاکہ ہم یوسف سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ بندۂ مخلص محبتِ الٰہی اور خدا پرستی کا وہ ذوق رکھتا ہے جو اس کو غیر خدا کی محبت اور بندگی سے روک دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے دل کے لیے کوئی شے ایمان سے زیادہ شیریں ولذیذ، خوش آیند اور پرکشش نہیں رہ جاتی، اور یہ باطنی کیفیت

تقاضا کرتی ہے کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچ اُٹھے، اور پھر ہر دم اسی کی طرف جھکا رہے، اسی کے ذکر میں مشغول رہے، اسی کے خوف سے لرزاں اور اسی کی نوازشوں کا امیدوار رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ...... (ق)

جو غیب میں خدائے رحمٰن سے ڈرتا رہا اور اس کے حضور جذبۂ انابت سے بھرا ہوا دل لے کر حاضر ہوا...

محبت کا فطری اقتضا ہی یہی ہے کہ محب اگر ایک طرف وصالِ محبوب کی امیدوں سے سرشار ہوتا ہے تو ساتھ ہی حصولِ مراد کی ناکامیوں کے تصور سے اندیشہ ناک بھی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا بندہ اور اس کا محب ہمیشہ خوف اور رجا کے دوگونہ جذبات رکھتا ہے

الفاظ اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

اس کے بالمقابل اس شخص کو لو جو اس دولتِ اخلاص سے بے بہرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ طلب و ارادہ اور محبتِ مطلق تو بہرحال اس کے دل میں بھی ہوگی کیونکہ طلب و محبت انسانی فطرت کے لوازم میں سے ہے۔ لیکن جس طرح ایک کمزور شاخ ہوا کے ہر اشارے پر جھک جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے بعینہٖ اسی طرح ایسا آدمی بھی قوتِ اخلاص سے محرومی کے باعث کسی بھی دروازے پر جھک جاتا اور اپنے اس جذبۂ طلب و محبت کو جس آستانے پر چاہے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

کبھی کسی حسنِ صورت پر ریجھتا ہے تو ایسی پست اور ذلیل ہستیوں کا غلام بن کر رہ جاتا ہے جو عام حالات میں خود اس کی غلامی کا شرف حاصل نہیں کر سکتیں۔ کبھی شوقِ نمود اور خواہشِ اقتدار کا دیوانہ بنتا ہے تو ذرا سی بات پر مگن، اور معمولی سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اپنے خوشامدیوں کا تو غلام ہو رہتا ہے اگرچہ وہ اس کی کتنی ہی جھوٹی تعریف کریں، اور

ملامت گروں کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے اگرچہ ان کی ملامت کتنی ہی برحق کیوں نہ ہو۔ کبھی مال و دولت کا اللہ تعبدیت اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ غرضیکہ اس کے دل کو موہ لینے والی جو چیز بھی سامنے آگئی اس نے اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دیا۔ انجام کار اس کی خواہش نفس ہی اس کا معبود بن جاتی ہے۔ پھر زندگی کا جو قدم بھی وہ اٹھاتا ہے ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہو کر ہی اٹھاتا ہے۔

نفس انسانی کی یہی دو حالتیں ہو سکتی ہیں:۔ یا تو وہ اللہ واحد کا مخلص پرستار ہو، یا پھر مخلوقات کا بندہ ہو کر رہے اور مختلف قسم کے شیاطین اس کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ تیسری کوئی شکل نہیں ہے۔ کیونکہ قلب انسانی اگر ماسوا سے کٹ کر اللہ واحد کا گرویدہ نہیں بنتا ہے تو شرک کی نجاستوں سے اس کا آلودہ رہنا ایک یقینی امر ہے۔ قرآن مجید جس ایمان کا مطالبہ کرتا ہے اس کی حقیقت اس سے ذرا بھی مختلف یا کم نہیں ہے، فرماتا ہے:۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ..... پس تو یکسو ہو کر اپنے رخ کو اللہ کے دین کی طرف ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ..... مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (سورہ روم ۱۳)

پھیر دے یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اس کی طرف جھکتے ہوئے، اور اس سے ڈرو، نماز قائم رکھو، مشرکوں میں سے نہ ہو۔

تمام ہی نوع انسان الٰہی دو گروہوں میں منقسم ہیں:۔ ایک تو حنیف اور مخلص بندوں کا گروہ ہے جو خدا ہی کی محبت اور عبودیت اور مخلصانہ طاعت کا حامل ہے۔ دوسرا مشرکین کا گروہ ہے جو خواہش نفس کا پرستار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور آل ابراہیم کو پہلے گروہ کا امام قرار دیا ہے جس طرح کہ اس نے فرعون اور آل فرعون کو دوسرے گروہ کا پیشوا ٹھیرایا ہے:۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (سورۂ انبیاء)

اور ہم نے ابراہیمؑ کو بخشے اسحٰقؑ اور یعقوبؑ بطور عطیہ اور ان میں ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے انھیں امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

اسی طرح فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرمایا گیا ہے :-

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۔ (سورۂ قصص)

اور ہم نے ان کو (گمراہی کا) لیڈر بنایا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے۔"

فتنۂ وحدۃ الوجود

اس گروہ فرعونی کی ضلالت کی ابتدا ان کی اس غلط فکری سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور قضا، مرضی اور مشیت، دونوں ایک چیز ہیں، اور انتہا اس کفر خالص پر ہوتی ہے کہ خالق اور مخلوق دونوں ایک ہی شے ہیں، جو خالق ہے وہی مخلوق ہے اور جو مخلوق ہے وہی خالق ہے۔ ان کو اصرار ہے کہ مخلوق بھی خالق کے ہم پلہ ہے۔ حالانکہ ابراہیمؑ کا اعلان یہ ہے کہ " تم اور تمہارے گمراہ باپ دادا نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے وہ سب کے سب، ماسوا پروردگار عالم کے، میرے دشمن ہیں (اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ سورۂ شعراء)

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، ان لوگوں کے مسلک کی بنیاد بعض مشائخ کے متشابہ اقوال پر ہے۔ یہ غریب تاویل بازی اور کج نظری کی اسی بیماری میں مبتلا ہو گئے جس کے شکار نصاریٰ ہو گئے تھے۔

فنا

ان متشابہ اقوال میں سے مثال کے طور پر ایک مشہور عام لفظ "فنا" کو لے لو، اور دیکھو کہ اس ایک لفظ کے پردے میں کیسے کیسے خطرناک اور سراپا الحاد فتنے

پہ چھپے ہوئے ہیں۔

فنا کی تین قسمیں یا درجے ہیں:۔ ایک درجہ تو وہ ہے جو انبیائے کرام اور اولیائے کاملین کو حاصل تھا، دوسرا درجہ عام صلحائے امت اور کم مرتبہ اولیاء کا ہے۔ تیسرا درجہ منافقوں اور ملحدوں کا ہے۔

پہلے درجہ یا قسم کی فنا کی حقیقت یہ ہے کہ عابد کی نگاہ میں اللہ کے سوا ہر شے بے حقیقت ہو کر رہ جائے، خدا ہی سے محبت ہو، اسی کی بندگی ہو، اسی پر بھروسہ ہو اور اسی سے ہر طرح کی مدد چاہی جائے۔ بندگی کا کمال یہ ہے کہ بندہ وہی پسند کرے جو خدا کو پسند ہو اور اسی سے محبت رکھے جو خدا کو محبوب ہو، مثلاً ملائکہ، انبیاء اور صلحاء۔ جس دل کی یہ حالت ہو جائے اس کو قرآن نے "قلب سلیم" کہا ہے۔ سلیم کے معنی ہیں محفوظ۔ اس لیے قلب سلیم وہ قلب ہے جو ماسوائے اللہ سے، یا ماسوائے عبادت الٰہی سے، یا ماسوائے مراد الٰہی سے یا ماسوائے محبتِ الٰہی سے پاک اور محفوظ ہو۔ خدا کی محبت اور بندگی کی اس کیفیت کو آپ فنا کے لفظ سے تعبیر کریں یا کسی اور لفظ سے، ہمیں اس سے چنداں بحث نہیں۔ البتہ یہ حقیقت ہر کا اصلی اسلام یہی ہے۔

دوسری قسم فنا کی یہ ہے کہ ماسوا کے خیال اور مشاہدے سے قلب یکسر بے نیاز ہو جائے۔ اکثر سالک اسی کیفیت میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کا باطن خدا کی محبت، عبادت اور اس کے ذکر کی طرف پوری طرح کھنچ اٹھتا ہے، ادھر دل چونکہ وہ کمزور ہوتے ہیں، اس لیے جلال و جمالِ خداوندی سے مرعوب و متحیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان میں اتنی قوت باقی نہیں رہ جاتی کہ ماسوا کو دیکھ سکیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا ان کے دلوں میں سرے سے گزر ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ غیر اللہ کا احساس تک کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی کیفیت قلبی تھی،

حضرت موسیٰؑ کی ماں کی، جب حضرت موسیٰؑ کو موجوں کے دوش پر بحکم الٰہی سوار کر دیا گیا تھا، جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ :-

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا (قصص) موسیٰؑ کی ماں کا دل "خالی" ہو گیا۔

"خالی ہو گیا" یعنے موسیٰ کے ذکر و فکر کے سوا ہر شے سے خالی ہو گیا۔ اس میں صرف موسیٰؑ ہی موسیٰؑ رہ گئے۔

یہ کیفیت ایسے اشخاص پر بالعموم طاری ہو جایا کرتی ہے جن پر محبت یا خوف یا امید کے کسی غیر معمولی جذبہ نے یکایک قبضہ کر لیا ہو۔ ایسے وقت ان کے دل میں اُس شے کے سوا، جس سے ان کی محبت یا خوف یا امید کا یہ زبردست جذبہ وابستہ ہوتا ہے، کسی اور چیز کا تصور راہ نہیں پاتا۔ پس ذکرِ الٰہی میں بھی اس صورتِ حال کا پیش آنا ایک امرِ واقعہ ہے۔ جب کسی ذاکر کو یہ صورتِ حال پیش آجاتی ہے تو اس کے اندر سے من و تو کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ وہ اپنے محبوب کو پاکر خود وجود سے غافل ہو جاتا ہے، اور اپنے مشہود میں محو ہو کر اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھتا ہے۔ اس کی نگاہِ باطن صرف ایک ذاتِ ازلی و حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو موجود پاتی ہے، اور باقی ساری کائنات اُس کے لیے معدوم بن جاتی ہے۔ جب یہ کیفیت شدت و قوت اختیار کر لیتی ہے، اور ساتھ ہی سالک کا دل اتنا کمزور بھی ہوتا ہے کہ من و تو کے امتیاز میں وہ حیران سا رہ جاتا ہے تو اس کے ذہن پر یہ گمان مستولی ہو جاتا ہے کہ وہی آپ اپنا محبوب ہے۔

یہ وہ کیفیت ہے جس کی حقیقت سمجھنے میں کتنی ہی تو میں ٹھوکریں کھا کر اپنے آپ کو گمراہی کے گڑھے میں ڈال چکی ہیں۔ انھوں نے اس کیفیت کو "اتحاد" سمجھ لیا یعنی یہ کہ وہ مقام ہے جہاں عاشق اپنے محبوب بالا اللہ تعالیٰ ہی میں مل جاتا ہے اور پھر ان دونوں کے وجود میں کوئی فرق،

کوئی غیریت اور کوئی دوئی نہیں رہ جاتی۔ بلکہ دونوں مل کر ایک وجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ صریح غلطی اور نادانی کی بات ہے۔ کیونکہ خالق کے ساتھ کوئی چیز بھی متحد نہیں ہو سکتی۔ اور نہ خالق کیا، کوئی چیز بھی کسی دوسری چیز کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی چیز کسی دوسری چیز سے متحد ہو سکتی ہے تو صرف اس شکل میں کہ دونوں اپنی ماہیت سے دست کش ہو جائیں، یا ان میں فساد رونما ہو جائے یا دونوں کے ملنے سے ایک تیسری شے پیدا ہو جائے جو ان دونوں میں سے ہر ایک سے الگ حقیقت رکھتی ہو۔ جس طرح کہ پانی اور دودھ، یا پانی اور شراب مل کر ایک تیسری شے بن جاتے ہیں، کہ پھر نہ اسے پانی کہہ سکتے ہیں نہ دودھ نہ شراب۔ ظاہر ہے کہ ذاتِ باری کے متعلق ان میں سے کسی بھی صورت اتحاد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کا اور اس کے عاشق کا متحد ہو جانا ایک ناممکن بات ہے۔ ہاں ان دونوں کی مراد اور مرضی میں اتحاد ہو سکتا ہے، ان کی پسند اور ناپسند میں یکسانی ہو سکتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ جو چیز محبوب کو بھلی معلوم ہو محب کو بھی بھلی لگے اور جس چیز سے محبوب کو نفرت ہو اس کو بھی نفرت ہو، جس کو محبوب دوست رکھتا ہو اس کو وہ بھی دوست رکھے اور جس کو محبوب دشمن قرار دیتا ہو اس کو وہ بھی دشمن سمجھے۔ یہی اتحاد ممکن ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ یہی، اور صرف یہی اتحاد ہوتا بھی ہے۔

○ فنا کی یہ قسم و نوعیت اپنے اندر گوناگوں نقائص رکھتی ہے۔ اولیائے کاملین مثلاً حضرت ابوبکر و عمر اور دیگر اکابر مہاجرین و انصار میں سے کوئی بھی اس کا حامل نہ تھا، انبیائے کرام کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ چیز صحابہ کے بعد عالم وجود میں آئی۔ کیونکہ یہ ضعفِ قلب سے پیدا ہوتی ہے، اور صحابہ کے قلوب واردات ایمانی کا بوجھ اٹھانے میں اتنے کامل، اتنے قوی اور اتنے ثابت و ضابط تھے کہ کسی حال میں بھی اُن کی عقلیں معطل نہ ہوتی تھیں، نہ اُن پر کوئی ضعف طاری ہوتا تھا نہ کوئی سکر، نہ کبھی ان پر عشق کی حیرانی چھاتی تھی نہ وجد و جال کی وارفتگی۔ ان باتوں کی ابتدا تو

بصرہ کے تابعین سے ہوئی ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ بعض لوگوں نے قرآن سُنا اور اس کے جلال کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئے۔ حتیٰ کہ بعض کی اسی عالم میں روح ہی پرواز کرگئی۔ مثلاً ابوجہیر اور قاضی زرارہ بن اوفیؒ۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلا اور اکابر صوفیہ میں سے بھی کتنے ہی فنا اور سکر کی ایسی کیفیت میں مبتلا ہوتے نظر آئے جس نے ان کی قوتِ تمیز کو ناکارہ بناکر رکھ دیا تھا، یہاں تک کہ وہ اسی عالمِ مدہوشی میں ایسی باتیں کہہ گئے جن کی غلطی کا، ہوش بجا ہونے کے بعد، انھوں نے خود اعتراف کیا۔ جیساکہ حضرت ابویزیدؒ، ابوالحسنؒ اور ابوبکر شبلیؒ وغیرہ بزرگوں کی بابت بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے برخلاف حضرت ابوسلیمانؒ دارانی، معروف کرخیؒ، فضیل بن عیاضؒ اور حضرت جنیدؒ وغیرہ بزرگ، جن کے قلوب مضبوط تھے اور جن کے قوائے عقل و تمیز ہر حال میں بجا رہتے تھے، کبھی اس کیفیت میں مبتلا نہ ہوئے۔ اور یہی محبت و بندگی کا حقیقی کمال ہے۔ جو لوگ اس نعمتِ کمال سے بہرہ ور ہوتے ہیں ان کی نظر خدا کی محبت، عبادت اور طلب کے سوا کسی غیر شے پر نہیں جاتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ علم اور وہ قوتِ تمیز بھی ان کے ساتھ رہتی ہے جو انھیں تمام امور اور اشیاء کا، ان کی اصل صورت میں، مشاہدہ کراتی رہتی ہے۔ وہ اپنی بصیرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ ہی کے امر و حکم سے قائم ہے، اور اسی کی مشیت سارے معاملات کی صورت گری کرتی رہتی ہے۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کے سامنے سدا یہ رازِ فطرت بے نقاب رہتا ہے کہ ساری کائنات اللہ جل مجدہٗ کے سامنے سرنگندہ اور اس کی تسبیح میں مشغول ہے۔ یہ مشاہدہ ان کے لیے بڑی عبرت و موعظت کا سبب بنتا ہے، اور ان کے دینی اخلاص اور بندگی کے جذبات کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔

قرآن جس عبودیت کی طرف بلاتا ہے وہ یہی ہے۔ سچے مومنوں اور کامل عارفوں نے

جن کے سرتاج ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی عبودیت کو اختیار کیا تھا۔ شب معراج میں جب آپؐ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور وہاں آیاتِ الٰہی کا آپؐ نے مشاہدہ فرمایا اور پھر عبد و معبود میں ناقابلِ فہم و بیان راز و نیاز ہوئے ——— تو باوجودیکہ یہ قربِ الٰہی کا وہ مقام تھا جو کسی اور کو نصیب نہ ہوا، مگر اس وقت بھی آپؐ کی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، نہ آپؐ پر کسی قسم کی خود فراموشی طاری ہوئی اور نہ آپؐ کی عقل و تمیز معطل ہوئی۔ بخلاف موسیٰ علیہ السلام کے، کہ طور پر تجلیِ رب کا عکس دیکھنے کی بھی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔

فنا کی تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی موجود دکھائی نہ پڑے اور خالق کا وجود ہی عین مخلوقات کا وجود قرار پا جائے۔ گویا عبد اور معبود میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ فنا کی یہ نوعیت اُن گمراہوں اور ملحدوں کی اختیار کردہ ہے جو حلول اور اتحاد کے قعرِ ضلالت میں جا گرے ہیں،

کلام مشائخ کی صحیح تاویل اہلِ حق و معرفت بزرگوں نے جو اس قسم کے جملے کہے ہیں کہ "ما اریٰ غیر اللہ" یا "لا انظر الیٰ غیر اللہ"[ل] وغیر ذالک تو ان کی مراد ان اقوال سے یہ ہے کہ "میں اللہ کے سوا کسی کو کائنات کا پروردگار یا خالق یا مدبر یا الٰہ نہیں دیکھتا"۔ اور "میں کسی غیر کی طرف محبت یا خوف یا امید کی نگاہیں نہیں ڈالتا"۔ (ان کے اس مدعا کی نظری معقولیت بالکل واضح ہے) انسان کی نگاہ اسی چیز کی طرف اٹھتی ہے جو اس کے دل میں کوئی جگہ رکھتی ہو، جس سے اس کو کوئی محبت یا خوف ہو۔ ورنہ جس چیز سے نہ اس کو کوئی محبت ہو نہ کوئی عداوت، نہ کوئی طمع ہو نہ کوئی خوف، اس کی طرف اُس کا دل کبھی متوجہ نہ ہوگا۔ اور اگر کبھی اس کی نگاہ اس پر اتفاقاً پڑے گی بھی تو بالکل اسی طرح جیسے راہ چلتے کسی

ل ترجمہ: "میں اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتا" "میں اللہ کے سوا کسی کی طرف نگاہ نہیں کرتا"۔

کی نظر کنکر پتھر پر پڑ جایا کرتی ہے۔ سو جہاں تک سچے بزرگانِ دین کا تعلق ہے، یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت قابلِ ستائش حقیقت، کہ وہ مخلوقات پر اسی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے، اور ان کے اقوالِ مذکورہ کا یہی مدعا ہے۔ وہ ان جملوں میں توحید اور اخلاص کی اس کامل اور بے آمیز حقیقت کا اعلان فرماتے ہیں کہ بندہ کو غیر اللہ کی طرف التفات نہ کرنا چاہیے، اور نہ کسی ماسوا کی طرف محبت یا خوف یا رجا کی آنکھ اٹھانی چاہیے۔ اس کے بخلاف اس کے دل کو تمام مخلوقات کے ذکر و فکر سے خالی اور بے نیاز ہونا چاہیے، اور جب بھی ان کی طرف دیکھے اللہ کے نور کے ساتھ دیکھے۔ یعنی حق کے کانوں سے سُنے، حق کی نظروں سے دیکھے، حق کے ہاتھوں سے پکڑے، حق کے پاؤں سے چلے۔ انہی چیزوں سے محبت رکھے جن سے خدا کو محبت ہو اور ان باتوں سے نفرت کرے جن سے خدا کو نفرت ہو۔ اس دنیا کو برتنے میں اللہ سے ڈرتا ہے، اور اللہ کی رضا کے معاملہ میں ساری مخلوق کی مخالفتوں اور عداوتوں سے بے خطر ہو۔ یہی وہ دل ہے جو "سلیم" اور "حنیف" ہے جس کو عارف و موحد کہا گیا ہے، اور جس کو مومن و مسلم کا خطاب زیب دیتا ہے۔ جس طرح فنا کی تیسری قسم، یعنی فنا فی الوجود، فرعون اور اس کے پیرووں مثلاً قرامطہ وغیرہ کی اختیار کردہ ہے، اسی طرح یہ قسم انبیائے کرام اور ان کے صالح پیرووں کے مخصوصات میں سے ہے۔ اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قسم اللہ تعالیٰ کے نزدیک محمود ہے۔ جتنے سچے اور قابلِ اتباع مشائخ گذرے ہیں سب کا اللہ تعالیٰ کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد تھا کہ وہ ساری مخلوق سے بالکل الگ ہستی ہے، وہ قدیم ہے اور باقی ساری موجودات حادث ہیں، اور ذاتِ قدیم کا تمام اشیائے حادث سے الگ اور مبائن ہونا ایک ضروری امر ہے۔ ان بزرگوں نے راہِ سلوک پیش آنے والے شبہات و امراضِ قلب سے بھی لوگوں کو پوری طرح باخبر کر دیا ہے انھوں نے متنبہ کیا ہے کہ بعض لوگ سلوکِ باطن کے دوران

مشاہدہ تو مخلوقات کا کرتے ہیں لیکن قلب میں قوتِ تمیز نہ رہ جانے کے باعث انھیں کو خالق گمان کر بیٹھتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی شخص سورج کی شعاعوں کو دیکھ کر یہ گمان کر بیٹھے کہ یہی سورج ہیں، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔

فرق و جمع

فنا کی اصطلاح سے ملتی جلتی "فرق اور جمع" کی اصطلاحیں بھی ہیں، اور ان میں بھی اسی قسم کے خطرناک رسوم عبادت اور تصورات داخل ہیں جو فنا کی اصطلاح میں موجود ہیں۔ ایک بندہ جب مخلوقات کی گوناگونی اور کثرت پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی نگاہ اور اس کا قلب دونوں ہی ان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ مختلف چیزوں کو سامنے پاتا ہے اس لیے مختلف سمتوں میں اس کی نظریں اٹکی رہتی ہیں۔ کہیں شوق و محبت کی بنا پر، کہیں خوف کی بنا پر، اور کہیں امید کی بنا پر۔ پھر قلب و نظر کے اس اضطراب اور تفرق کے بعد جب اس کو "جمع" کا سر چشمہ اطمینان ہاتھ آجاتا ہے تو اس کی آوارگی نظر جمعیت سے بدل جاتی ہے، اور اس کا دل خدا کی وحدانیت اور خالص عبودیت پر آ کر جم جاتا ہے۔ اس وقت اس کی محبت، استعانت، خوف، رجا اور توکل کے سارے احساسات اسی ایک ذات والا صفات پر آ کر مرتکز ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت استغراق میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے قلب کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ مخلوقات کی طرف بھی دیکھ سکے اور اس طرح خالق اور مخلوق میں امتیاز کر پائے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قلب مرکزِ حق پر معتکف ہو جاتا ہے اور خلق سے بالقصد توجہ ہٹا لیتا ہے۔ یہ فنا کی قسمِ ثانی سے بالکل مشابہ کیفیت ہے اور وہی ضعفِ قلب کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد "جمع" کی ایک دوسری قسم آتی ہے، اور وہ یہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ پر خیال دل یکسوئی کے ساتھ جما ہوا ہو وہاں اس کو یہ بھی دکھائی دیتا ہو کہ تمام کائنات

اللہ ہی کی قدرت سے قائم اور اسی کے حکم و تدبیر سے سرگرم عمل ہے، اور یہ کہ مخلوقات کی ساری کثرت اور گوناگونی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں گم اور معدوم ہے، اور یہ کہ اللہ ہی ساری خلقت کا پروردگار، معبود، خالق اور مالک ہے۔ ایسا دل ایک طرف تو اخلاص و محبت خوف و رجا، توکل و استعانت، حب للہ اور بغض للہ کے ملکوتی جذبات سے لبریز اور ذات خداوندی پر مجتمع رہتا ہے، دوسری طرف خالق اور مخلوق کا فرق و امتیاز بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا یہی سچی عبدیت ہے، اور یہی کلمۂ طیبہ کی حقیقی روح ہے۔ لاالٰہ الا اللہ کی شہادت دینے کا عملی مفہوم اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ چیز قلب میں غیر اللہ کی معبودیت کا کوئی دھندلا سا بھی نشان نہیں چھوڑتی، اور اس پر حق تعالیٰ کی الٰہیت کا عمیق اور ہمہ گیر نقش بٹھا دیتی ہے گویا ایک ایک مخلوق کی معبودیت کی نفی، اللہ رب العالمین کی تنہا معبودیت کا کامل اور لازوال اثبات کر دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں دل اسی ایک ذات پر آکر ٹک جاتا اور غیر اللہ کے اضطراب انگیز تعلقات سے بالکل کنارہ کش ہو رہتا ہے۔ پھر اس کی تمام تر توجہات کا مرکز اللہ ہی بن جاتا ہے، اور اس کے ذکر و فکر، عشق و محبت، تعظیم و عبادت، طلب و رضا، طاعت امر اور خوف و رجا کے جذبات اسی ایک کعبۂ مقصود کے طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ ایک لمحے کے لیے اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتا کہ مخلوقات، عالم واقعہ میں اپنا الگ اور مستقل وجود رکھتی ہیں، ایسا وجود، جو وجود باری تعالیٰ سے یکسر جدا ہے۔ جب بندہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو وہ صحیح معنوں میں موحد بن جاتا ہے۔ اس امر کی طرف ان احادیث سے کھلی ہوئی رہنمائی ہوتی ہے جنہیں فرمایا گیا ہے کہ "سب سے افضل ذکر لاالٰہ الا اللہ ہے"۔

ذکر کے غیر مشروع طریقے

بد قسمتی سے لوگوں نے ذکر کے باب میں بھی کجیٔ ذہن کے نہایت خطرناک مظاہرے کیے ہیں۔ وہ اتنے واضح ارشاد

رسول کے باوجود یہ گمان کر بیٹھے کہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر محض عوام کے لیے ہے ، اور خواص کا طریقۂ ذکر یہ ہے کہ صرف لفظ "اللہ" کا ورد کیا جائے ، اور اخص الخواص کو اس لفظ کے اظہار کی بھی ضرورت نہیں ، ان کے لیے "یا ہو" (اے وہ) کا ذکر کافی ہے . لیکن یہ کھلی ہوئی غلطی اور گمراہی ہے ، اور اپنے ان دعاوی پر یہ حضرات آیاتِ قرآنی سے جو استدلال کرتے ہیں وہ تو تحریفِ معنوی اور تاویلِ فاسد کا شاہکار ہے . مثال کے طور پر ان کے بعض استدلالات کو لیجیے :۔ آیت قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ (انعام) سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ "کہو اللہ" معلوم ہوا کہ صرف "اللہ" "اللہ" کہنا ہی ذکر میں کافی ہے ۔ لیکن ایک معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی ، جس کو قرآنی تعلیمات اور عربی اسالیب سے ذرا بھی مس ہو ، سیاقِ کلام کو سامنے رکھ کر ایک نظر میں محسوس کر سکتا ہے کہ لفظ "اللہ" یہاں تنہا نہیں ہے ، بلکہ فی الواقع ایک پورے جملے کا ٹکڑا ہے ، جس کے باقی اجزاء کو موقع محل کے تقاضے اور قرینے کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ ان لفظوں (قل اللہ) سے پہلے کا جملہ استفہامیہ ہے اور استفہام کا جواب بالعموم اسی طرح دیا جاتا ہے کہ استفہامیہ جملے کے بیشتر الفاظ ، جن کو جواب والے جملے میں لایا جاتا ہو ، حذف کر دیے جاتے ہیں ۔ چنانچہ اس جملے کے پورے اجزاء کو اگر ظاہر کر دیا جائے تو یوں ہوگا " قُلِ اللّٰهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ " کیونکہ یہ قول ان یہودیوں کے رد میں ارشاد ہوا ہے جو نزولِ قرآن کے بارے میں کہتے تھے کہ " مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِنْ شَيْءٍ " (اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر حقیقت یہی ہے کہ اللہ بشر پر اپنا کلام نہیں اتارا کرتا تو پھر بتاؤ وہ کتاب جو موسیٰ لیکر تمہارے پاس آئے تھے کس نے اتاری تھی ؟ (مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ) پھر خدا خود ہی

فرماتا ہے کہ "اے پیغمبر! کہہ دو اللہ نے" یعنے وہ اللہ ہی ہے جس نے کتاب موسیٰؑ کو نازل کیا تھا۔

اب اسم مضمر یعنے "یا ہو" کو ذکرِ مشروع قرار دینے کے مسئلے کو لیجیے۔ اس سلسلہ میں استدلال کے لئے ان لوگوں نے آیت وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ (آلِ عمران) کو اپنی تاویلاتِ فاسدہ کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ " ۂ " کی تاویل خدا اور راسخین فی العلم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کلامِ الٰہی کے ساتھ اس سے بڑھکر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے جو یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

الغرض محض ایک لفظ کے ذریعہ، خواہ وہ کوئی اسم ظاہر ہو یا کوئی اسم مضمر ہو، اللہ کا ذکر نہ تو سلف صالحین سے منقول ہے نہ پیغمبر نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ جملہ نہیں ہو سکتا جس سے کوئی پوری بات منتج ہو۔ اس لیے اس کو ایمان یا کفر کا مدار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایک لفظ صرف تصورِ مطلق پیدا کر سکتا ہے، جس پر نفی یا اثبات کا کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا الا آنکہ قلب میں پہلے سے کوئی ایسی معرفت اور حالت موجود ہو جو اس لفظ سے مل کر ایک متعین مفہوم پیدا کر دے۔ ورنہ عام حالات میں اکیلا ایک لفظ قلب کو ایک مجرد تصور کے سوا کوئی پوری بات اور مفید یقین مفہوم نہیں دے سکتا۔ حالانکہ شریعت نے جتنے اذکار تعلیم فرمائے ہیں وہ سب کے سب ایسے ہی ہیں جو بذاتِ خود، نہ کسی اور چیز کی مدد سے، پوری پوری باتوں کا مفہوم ادا کرنے والے ہیں۔ اس نے ہمیں زیرِ بحث قسم کے ذکر کی دو دھاری تلوار چلانے کی قطعی اجازت نہیں دی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا انھوں نے اس تلوار سے خود اپنی گردنیں آپ کاٹ لیں، اور توحید و معرفتِ الٰہی کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے بجائے طرح طرح

کے الحاد اور عقیدۂ "اتحاد" کے قعرِ ضلالت میں جا گرے۔ خصوصاً اسمِ مضمر یعنی "یا ہو یا ہو" کا ذکر خوفناک فتنوں کا سرچشمہ ہے۔ اس طریقۂ ذکر کو طریقۂ نبوی سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں۔ بلکہ یہ سراپا بدعت اور ضلالت ہے۔ کیونکہ جو شخص "یا ہو یا ہو" کی رٹ لگاتا رہتا ہے اور ذاتِ باری کا اصل نام نہیں لیتا اس کے اس مبہم قول میں "ہو" کی ضمیر کا مرجع صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جس کا تصور اس کے قلب میں پہلے سے موجود ہو اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ہر قلب کا 'ہر حال میں' ذاتِ الٰہی کا صحیح تصور رکھنا اور نورِ حق سے معمور ہونا ضروری نہیں۔ وہ کبھی گمراہ ہوتا ہے کبھی ہدایت یاب۔ کبھی معبود اور معبودیت کا صحیح تصور رکھتا ہے اور کبھی غلط۔ اس لیے "یا ہو" کہتے رہنے کے معنے لازمی طور پر اللہ واحد ہی کو پکارنے کے نہیں ہو سکتے، بلکہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ جس ذات کو وہ پکار رہا ہے اس کا تصور اس کے ذہن میں اس تصور سے خاصا دور ہو جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا فی الواقع ہے۔ پس یہ طریقۂ ذکر گوناگوں دشمنِ ایمان خطرات سے لبریز ہے۔ تنہا کوئی ایک لفظ دین میں کوئی اعتبار نہیں رکھتا، اور جمہور اہلِ اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فقط ایک لفظ "اللہ" کہہ دینے پر کسی کے مومن ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ بیضاء نے کسی کو محض ایک لفظ کے ذریعہ ذکر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

یہاں قرآنِ حمید کی ان آیات سے دھوکا نہ کھانا چاہیے جن میں "اپنے رب کے نام کو یاد کرو" اور "اپنے رب کے نام کی پاکی بیان کرو" کے الفاظ آئے ہیں۔ ان آیات میں "ذکرِ اسم" سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف "اللہ" کا لفظ دہراتے رہو، بلکہ خود قرآن کے مبلغ اور شارح نے اس "ذکر" کے مفہوم اور طریقہ کی توضیح فرما کر ہمیں بتا دیا ہے کہ اس 'ذکرِ اسم' سے مراد ایسے جملوں کا ورد ہے جو اللہ تعالےٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح پر مشتمل ہوں۔

چنانچہ جب آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (واقعہ) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس حکم پر رکوع میں عمل کرو" اور جب آیت سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (اعلیٰ) نازل ہوئی تو فرمایا کہ "اس حکم پہ سجدہ میں عمل کرو" پھر ان احکام پہ عمل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ رکوع میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ" اور سجدہ میں "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى" کہا جائے۔ معلوم ہوا کہ اسمِ رب کی تسبیح سے مراد ایسے جملوں کا ورد ہے جو اللہ تعالیٰ کی حمد اور پاکی کا مفہوم رکھتے ہوں، نہ کہ فقط ایک لفظ "اللہ" کا ورد۔ مسلمانوں کے لیے نمازوں، اذانوں عیدوں اور حج کے مراسم میں جو اذکار مقرر اور مشروع کیے گئے ہیں وہ سب کے سب پورے پورے جملوں کی شکل میں ہیں، نہ کہ مفرد الفاظ کی شکل میں۔ مفرد الفاظ کی شکل میں خواہ وہ اسم ظاہر ہوں یا ضمیر، اللہ کا ذکر شریعت میں کوئی بنیاد ہی نہیں رکھتا، چہ جائے کہ اس کو اکابر اولیاء اور عارفین کاملین کا خاص طریقۂ ذکر کہا جائے۔ یہ تو طرح طرح کی بدعتوں اور گمراہیوں کا سرچشمہ ہے۔

سلامتیِ دین کی راہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، دین کی بنیاد دو چیزوں پر ہے:۔ ایک تو یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کی جائے، دوسری یہ کہ اللہ کی بندگی اس طریقہ پر کی جائے جو مشروع ہو، نہ کہ خود ساختہ اور بدعی طریقوں سے۔ یہی حقیقت ہے جو آیتِ ذیل میں واضح کی گئی ہے:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ	سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کا اندیشہ رکھتا
فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ	ہو اس کو چاہیے کہ صالح عمل کرے اور اپنے رب
رَبِّهٖٓ اَحَدًا (سورہ کہف)	کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اور یہی وہ جمالِ معنی ہے جو شہادت کے دونوں کلموں کے ظاہر و باطن میں جلوہ گر ہے:۔

کلمۂ اولیٰ لاالٰہ الا اللہ" میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے، اور کلمۂ ثانیہ "محمد رسول اللہ" میں اس امر کی شہادت ہے کہ محمدؐ ہی وہ پیامبر ہیں جنہوں نے معبود برحق کے احکام ہم تک پہنچائے ہیں، اس وجہ سے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے ارشادات کی تصدیق اور ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ خدا کے اس پیامبر نے اپنے فرائض نبوت کو ادا کرتے ہوئے ان تمام باتوں اور طریقوں کی روزِ روشن کی طرح وضاحت کردی ہے جن کے ذریعہ ایک بندہ کو اپنے معبود کی عبادت کرنی چاہیے، اور عبادت کے ان تمام طریقوں سے روک دیا ہے جو من گھڑت ہوں اور جن کی کوئی اصل کتاب وسنت میں نہ ملتی ہو۔ اس لیے جس طرح ہم اس امر کے مکلف ہیں کہ صرف اللہ ہی سے ڈریں، اسی پر ہر معاملہ میں بھروسہ رکھیں، اسی سے مدد مانگیں، اسی کو پکاریں، اسی کو اپنی رغبتوں کا مرکز بنائیں، اور صرف اسی کی بندگی کریں، اسی طرح ہمیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ رسولؐ کا اتباع کریں، اس کے احکام کی بلا چون وچرا پابندی کریں، اس کے نقوشِ قدم کو اپنا ہادی ورہبر بنائیں، حلال اُسے جانیں جس کو اس نے حلال گردانا ہو اور حرام اسے سمجھیں جس کو اس نے حرام ٹھیرایا ہو، اور دین صرف اس چیز کو مانیں جس کا اس کے قول وفعل میں نشان ملتا ہو۔

- پورا قرآن انہی حقائق اور مبادیٔ دین کی تشریحات سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے جس ورق کو دیکھو بندگی اور عبودیت کا یہی مفہوم بے نقاب نظر آئے گا۔ عبادت، انابت، خشیت، استعانت، توکل، خوف اور تقویٰ کا جہاں بھی ذکر ہوگا ہر ایک کی نسبت اللہ جل مجدہٗ ہی کی طرف ہوگی۔ صرف دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ کے ساتھ اس کے رسول بھی شریک ہیں:۔ ایک تو اطاعت، دوسری محبت، یعنی اطاعت اور محبت جس طرح خدا کی کرنی چاہیے، اسی طرح —— اس کی تبعیت میں —— رسول کی بھی کرنی چاہیے۔ باقی چیزوں میں رسول کسی معنی میں بھی، اللہ کے شریک نہیں۔ بلکہ عام انسانوں کی طرح خود وہ بھی اس پر مامور ہیں کہ اللہ ہی کی عبادت کریں، اسی پر

بھروسہ رکھیں، اسی سے طلب اعانت کریں اور اسی کے حضور اپنی التجائیں پیش کریں۔ شیطان نے نصاریٰ وغیرہ کو اسی معاملہ میں گمراہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں وہ اپنے انبیاء اور اولیاء کو ان کے صحیح موقف پر نہ رکھ سکے اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی مخصوص صفات میں انھوں نے انھیں بھی شریک کر دیا۔ انہی سے دعائیں مانگنے اور انہی پر توکل کرنے لگے۔ لیکن مومنین مخلصین کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی، اور وہ صراط مستقیم پر چل کر مغضوبوں اور گمراہوں کے ملعون گروہوں میں شامل ہونے سے محفوظ رہے۔ انھوں نے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کیا، اپنی پیشانیاں اسی کے آستانے پر جھکائیں، اسی کو مصیبتوں میں پکارا، اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کیں۔ اسی کی بارگاہ میں عاجزانہ جھکے، اپنے معاملات کو اسی کے حوالہ کر دیا، اور ہر قدم پر اسی پر کامل بھروسہ رکھا ——— پھر اس کے رسولوں کی اطاعت کی، ان سے محبت کی، ان کی تعظیم و تکریم کی، ان سے رفاقت اور موالات کا رشتہ استوار کیا، کٹھن گھڑیوں میں ان کے لئے جان کی بازی لگائی، اپنے اعمال میں ان کی ہدایتوں پر کاربند رہے اور ان کے روشن کیے ہوئے چراغ لے کر زندگی کی منزلیں طے کیں۔

یہی وہ دینِ اسلام ہے جس کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تمام انبیاء آتے رہے، اور جس کے سوا اللہ کے دربار میں کوئی اور دین مقبول نہیں۔ اور یہی ہے عبادت کی حقیقت۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو اس حقیقت کی کامل معرفت عطا فرمائے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنی اپنی زندگیاں ڈھالنے کا عزم اور استقلال مرحمت کرے۔ آمین۔